ممتاز حسین کے افسانے

افسانے

ممتاز حسین

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Mumtaz Hussain
Goal A'inak Kay Pichay / Mumtaz Hussain.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2010.
160pp.
1. Urdu Literature - Short Stories.
I. Title.

2010ء
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2347-4
ISBN-13: 978-969-35-2347-8

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall) Lahore 54000 PAKISTAN
Phones 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

فہرست

CS
CamScanner

کاغذ کا اظہار

کامران ندیم نے ایک عجیب مشکل میں ڈال دیا۔ مجھ پہ سوال کر ڈالا۔ تحریر کا عمل کیسے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ میں سوچ میں پڑ گیا لکھنا تو مجھے آتا نہیں اگر لکھنا پڑے۔ تو لکھنا تو ایسے ہی ہے جیسے ہوائی جہاز کا اڑانا ہوائی جہاز اُڑانے کے لیے شروعات تو پہلے سائیکل چلانے سے ہی ہوگی۔ سائیکل تو ملی نہیں سائیکل کا پیڈل مل گیا ہے انگلی سائیکل پہ سوار ہاتھی کے پاس گیا اس سے التجا کی یار اس پیڈل پے سائیکل تو لگا دو۔

ہاتھی نے کہا واہ یار تم لطیفہ بہت اچھا سناتے ہو۔ جناب لطیفہ سنانے والا کامیاب کہانی گر ہوتا ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہانی سنانا اور کہانی گھڑنا تو دو مختلف گر ہیں۔ میں نے ہاتھی سے پوچھا۔ لطیفہ تو سنا دیا تم نے پسند کر لیا۔ لکھوں کیسے ہاتھی نے کہا مشتاق یوسفی کی انگلیوں کی میل اکٹھی کر۔ میں سوچ میں پڑ گیا یار یہ مشکل کام کیسے کروں۔ خیال آیا یوسفی صاحب کے پڑوس میں نائی ہے اس سے یوسفی صاحب ناخن تو کٹواتے ہوں گے۔ وہ ناخن اکٹھے کر لوں۔ لگا نائی کی دکان کے چکر کاٹنے نائی سے میں نے پوچھا۔ تم ناخن بھی کاٹتے ہو۔ نائی بولا ہاں میں ختنے بھی کرتا ہوں۔ فوراً دونوں ہاتھ پتلون کی زنجیر پہ پڑے۔

میرے منہ میں بے اختیار نکلا مجھے مشتاق یوسفی کے ناخن چاہئیں۔ نائی نے کہا بدھ کو آنا۔ بدھ کو آرائش گیسو اور زیبائش انگلیاں کے لیے آتے ہیں۔ میں نے اونچی کرسی کے سامنے تختے والے میز پہ ناخن کاٹنے والے نیرنے کو رشک سے دیکھا اور سوچا کاش میں اس نائی کا نیرنا ہی ہوتا۔ بدھ کو نائی کے پاس پہنچا تو اس نے کہا یہ فرش پہ یوسفی صاحب کے ناخن پڑے ہیں ابھی کاٹے ہیں خود ہی اٹھا لے۔ میں نے ناخن اکٹھے کیے اور اینگل سائیکل کے ہاتھی پہ گیا۔ یہ لو۔ ناخن بھی اور میل بھی ہے۔ اس نے کہا۔ جاؤ اب پطرس بخاری سے چھٹانک بھر آٹا لے آؤ لئی بنانی ہے میں پطرس بخاری کے گھر روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچا تو پطرس صاحب مرزا صاحب کی بائیسکل کی چین میں کتے باندھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا پطرس صاحب یہ کیا کر رہے ہیں۔ پطرس صاحب نے فرمایا اس کے کتے فیل ہو گئے ہیں۔ اور بولے مجھ سے کچھ کام ہے۔ ہاں مجھے تھوڑا سا آٹا چاہیے۔ پطرس صاحب نے کہا۔ بابا معاف کرو جمعرات کو آنا۔ میں نے اصرار کیا۔ سرداریاں قائم بچے جیندے رہین۔ صرف ایک چھٹانک آنے کا سوال ہے۔ انہوں نے سائیکل کی چین سے انگلی پہ گریس لپیٹ کر مجھے دے دی لو والائتی گھی ہے۔ صحت اور توانائی کے لیے فائدہ مند ہے۔ میں گریس لے کے ہاتھی پہ پہنچا۔ اس نے مجھے پھر لمبے سفر پہ بھیج دیا۔ جاؤ عصمت چغتائی سے کاغذ لے کے آ۔ میں ان کے گھر پہنچا تو دروازہ کھلا تھا میں اندر گھس گیا آواز دی کوئی بھی نہیں تھا۔ تجسس نے بلی کو مارنے کی ہمت دے دی۔ اور آگے گیا تو خواب گاہ سے چیز چیز کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اندر گیا تو عصمت چغتائی کا لحاف کبھی سجدے میں کبھی رکوع میں اُٹھک بیٹھک کر رہا تھا۔ میں نے گلہ صاف کرنے کے بہانے متوجہ کیا تو عصمت بولیں۔ کون ہو مرد ہو عورت ہو۔ میں نے مودبانہ انداز میں ہاتھ باندھ کے کہا میں مرد ہوں۔ بھاگ جاؤ میرے لحاف میں صرف عورتوں کو آنے کی اجازت ہے۔

میں اپنا سا منہ لے کے ہاتھی کے پاس آیا۔ ہاتھی اپنا سا سونڈھ اٹھا کے ہنسا۔ مجھے

پتہ تھا۔ تم ایسا کرو فارمیسی سے پونڈا لے کے سعادت حسن منٹو کے پاس چلے جاؤ تمہارا کام ہو جائے گا۔ اور ہاں کالی شلوار پہن کے جانا۔ میں گرتا پڑتا منٹو صاحب کے گھر پہنچا۔ کنڈا کھٹکھٹایا تو اندر سے آواز آئی۔ ''او پڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ وال آف دی لالٹین ـــ لالٹین ـــ'' مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ میں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا جی میں ـــ اندر سے آواز آئی اوے ٹوبہ ٹیک سنگھا۔ تو آ گیا ایں۔ میں کہنے ہی والا تھا۔ منٹو صاحب نے دروازہ کھول دیا۔ اوپر سے نیچے تک دیکھا فوراً بولے اندر آ جاؤ۔ جیسے ہی میں اندر گیا۔ منٹو صاحب کنڈا چڑھا دیا۔ اور لگے غور سے میری کالی شلوار کو گھورنے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا مدعا بیان کرتا۔ زور سے بولے ''کھول دو'' میں پلٹا اور فوراً کنڈا کھول کے پاؤں سر پہ۔ اور ہاتھ کالی شلوار کے آزار بند پہ فوراً وہاں سے نکل بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے سامنے دیکھا انتظار حسین کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے کہا چلو کام بن گیا۔ ایک تو پناہ لے لوں گا دوسرا ان سے کاغذ بھی جیسے ہی اندر پہنچا تو انتظار حسین کا زرد کتا بیٹھا تھا۔ زرد کتا اچھل کر میری گود میں بیٹھ گیا۔ میری گود میں میرے اندر غائب ہو گیا۔ میں بہت پریشان ہوا تلملانے لگا۔ ایسے میں انتظار حسین تشریف لے آئے۔ کاغذ مانگنے کی بجائے میں نے کہا میں مصیبت میں ہوں۔ کیا ہوا میاں زرد کتا بیٹھا تھا اندر گھس گیا ہے۔ انتظار حسین ہنسنے لگے ابے بے وقوف یہ زرد کتا نہیں ہے۔ یہ طمع دنیا ہے طمع دنیا کیا ہے۔ فرمایا طمع دنیا تیرا نفس ہے عرض کیا نفس کیا ہے طمع دنیا پستی ہے۔ میں نے استفسار کیا۔ انتظار حسین پستی کیا ہے۔ فرمایا دانشمندوں کی بہتات مجھے سمجھ نہیں آیا۔ انتظار حسین ذرا تفصیل سے بتائیں۔ ایک دفعہ ہماری سلطنت میں دانشمندوں کو پلاٹ بٹنے لگے۔ جو خود کو دانشمند گردانتے تھے۔ جوق در جوق دربار میں پہنچے پلاٹ لے کر واپس آئے۔ بادشاہ کا وزیر بہت عاقل تھا۔ دانشمندوں کی ریل پیل دیکھ کر اس نے ایک روز ٹھنڈا سانس بھرا۔ بادشاہ نے پوچھا تم نے ٹھنڈا سانس کیوں بھرا۔ وزیر نے جواب دیا۔ تیری سلطنت دانشمندوں سے خالی ہے۔ میں نے انتظار حسین سے پوچھا کیا

آپ کی سلطنت کاغذوں سے خالی ہے فرمایا ٹھہرو شاید ایک کاغذ کا ٹکڑا بچا ہوا ہے۔ کاغذ کا ٹکڑا مجھے تھمایا۔ میرے پیٹ میں درد اٹھا۔ میں التجا کی برائے مہربانی اس درد کو دور کر دیں۔ انتظار حسین نے وعدہ لیا۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا تب استعمال کرنا جب زرد کتا تیرے اندر نہ ہو۔ میں نے ہاں کی زرد کتا میرے پیٹ سے نکل کر میرے ساتھ ہو لیا۔ انتظار حسین نے کہا یہ آخری کاغذ کا ٹکڑا تھا جو میں نے بانٹ دیا ہے۔ تم میری نگری کے آخری آدمی ہو۔ میں کاغذ لیے ہاتھی کے پاس آیا۔ ہاتھی مسکرایا تم نے بڑا کام کیا ہے۔ اب ایسے کرو۔ اس کاغذ کے ٹکڑے کو مشتاق یوسفی کے ناموں و پطرس بخاری کی گریس سے چپکا دو۔ میں نے ویسا ہی کیا اور اس کاغذ کو لے کر کامران ندیم پہ پہنچا۔

کامران ندیم غصے میں آگ بگولا ہوا۔ یہ کیا لائے ہو۔ اور کہا میاں عشق وہ کھیل نہیں جو لونڈے کھیلیں اور کاغذ مجھے لوٹا دیا۔ میں نے کہا اس کاغذ کا کیا کروں ارے ہاں اس میں نسوار رکھ کے پڑیا بنا لیتا ہوں۔ نسوار کی چھینک سے دماغ کھل جاتا اور ناک اور منہ سے لفظ گرنے لگتے ہیں تو کیا اب احمد فراز کو ڈھونڈھو وہ تو کب سے دماغی نسوار کی دوکان بڑھا گئے۔

کیا کروں اس کاغذ کا میں نے اوپر کے ایک تہائی کاغذ کی تہہ لگائی۔ درمیان سے کاغذ کے دونوں کونوں کو ملایا اوپر کی نوک کی ایک اور تہہ درمیان سے آدھ کر کے تمام نوکوں کو ملایا ہاں یہ لو جہاز بن گیا۔ بھاگا بھاگا گیا اونچی عمارت کی آخری منزل سے کاغذ کے جہاز کو پھینکا۔ ارے یہ تو اڑنے لگا ہے مجھے جہاز اڑانا آ گیا۔ ایک تیز ہوا کے جھونکے نے وہ تھپڑ میرے جہاز کو رسید کیا لگا قلابازیاں کھانے۔ میرا دل ڈوبنے لگا بادلوں کی اوٹ سے کسی نے جھانکا میرے کان میں اقبال کی مونچھوں نے کھجلی کی جیسے وہ کہہ رہی ہوں۔

یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

پیش لفظ

رانجھے کوچ کیتا آیا ندی اُتے
ساتھ لایا یار مہانیاں نوں

مجھ میں اور رانجھے میں کئی قدریں مشترک ہیں۔ رانجھے نے عشق کی تلاش میں تخت ہزارہ کو خیر باد کہا۔ اور جھنگ آ گیا۔ میں نے جھنگ کو خیر باد کہا۔ اور براستہ لاہور، لندن سے نیویارک آ کر آرٹسٹوں کی بھینسوں پہ سے مکھیاں اڑانی شروع کر دیں۔

رانجھے نے ہیر کو پانے کے لیے کئی بھیس بدلے۔ کبھی نارنجی رنگ کا کنڈوپ پہن کے کاسہ اٹھایا تو کبھی کانوں میں مندریاں پہن لیں۔ میں نے رنگ تھوپ کر برش ہاتھ میں اٹھالیا۔

رانجھے نے فقیروں والا چوغہ پہنا تو میں نے بھی غلام عباس کا اوورکوٹ چڑھالیا۔

رانجھا جب خود ہی رانجھا رانجھا کرتے ہیر ہوا تو میں بھی ایک ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر رومی کا رقص درویش کرتا مست الست ہو کر اپنے اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔

جب مذہبی ٹھیکیداروں نے ہیر کی شادی زبردستی کھیڑے سے کر دی تو رانجھا کی فریاد کی چیخ نکلی۔ اسی طرح مذہب کے نام پر معصوم بچوں کے قتل کے دکھ سے میرے اندر کی تتلی بھی چیخی۔

رانجھے نے تو اپنی جان کا نذرانہ دے کر اپنی ہیر کو پا لیا تھا میں ابھی اسی کوشش میں راکھ میں انگلیاں پھیر رہا ہوں کہ شاید میری ہیر کی تصویر بن جائے۔ پردے کے پیچھے چلتی پھرتی تصویروں میں اپنی مطلوبہ ہیر کو تلاش کر رہا ہوں۔

قلم اٹھاتا ہوں تو دور کی چیزیں دھندلی لگتی ہیں لکھ تو سکتا ہوں لیکن جب دور دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو چیزیں غیر واضح نظر آنے لگتی ہیں اس لیے یہ گول عینک چڑھائی ہے اس کے پیچھے جو کچھ بھی ہے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ کو میری یہ کاوش پسند آئے گی۔ میرا جذبات و محسوسات اپنے اظہار کی راہیں خود ہی تلاش کر رہے ہیں میں نے اپنے جذبوں کو افسانوں میں ڈھال کر کتابی شکل میں آپ کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کی ہے بقول غالب

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

میں شکر گزار ہوں مرحوم ڈاکٹر فاروق احمد کا جن کی رہنمائی میرے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی اور مجھے اردو افسانے کی شاہراہ پر گامزن کیا۔

میں از حد ممنون ہوں پروفیسر خالدہ ظہور کا جنہوں نے بڑی توجہ اور انہماک سے اردو کے لفظوں کی ترتیب کو سنوارا اور اسے مناسب خدوخال دیئے۔

میں سپاس گذار ہوں کامران ندیم، ابوالفضل انصاری، احمد مبارک، جاوید اختر پاشا کا جن کی راتوں کی نیند حرام کر کے میں نے اپنے افسانے زبردستی انھیں سنائے۔

مجھے شکریہ ادا کرنا ہے خلیل الرحمٰن (اردو ٹائمنز) کا جنہوں نے کتاب کی تکمیل میں ہر موڑ پہ سہارا بخشا۔

ممنون احسان ہوں حلقہ ارباب ذوق نیویارک کے سب ساتھیوں کا جن کی تنقید اور تائید نے میری تحریروں کو جلا بخشی۔

تہہ دل سے سراپا تشکر ہوں ماموں ایمن کا جنہوں نے میری کتاب کے گیسوؤں کو سنوارا۔

ممنون ہوں عدنان خواجہ کا جس کے کیمرے نے میری عینک کو صاف اور مجھے دھندلا بنانے میں مدد کی۔

میں اپنے اُن ساتھیوں کی محبتوں کا قرض دار ہوں جنہوں نے میری نگارشات کو تنقید و تجزیہ کے قابل سمجھا جس سے میرے قلم کو نئی روشنی اور توانائی حاصل ہوئی۔ ولی دکنی کا یہ شعر میرے حسب حال ہے ۔

عشق کی راہ کے مسافر کو
ہر قدم تشنگی میں منزل ہے

ممتاز حسین

ممتاز حسین کے محاکات
یا
(لفظوں میں تصویریں)

میں نے ممتاز حسین کی دس گیارہ کہانیاں نہایت خوشگوار حیرت اور دلچسپی کے ساتھ پڑھیں ۔ ایک عرصہ سے بیرون ملک قیام کے باوجود ان کا اپنی مٹی، کلچر اور اپنے لوگوں سے تعلق اس قدر گہرا ہے کہ انسانی رویوں اور معاشرتی واقعات کی ہر تفصیل اپنی پوری جزیات کے ساتھ ان کے حافظے میں محفوظ اور تازہ ہے۔ جس سے ان کی بے مثل قوت مشاہدہ، حافظے اور حیات انسانی سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ ذہن ہی چیزیں یاد رکھتا ہے جن سے آپ کو دلچسپی ہو اور جنہیں آپ نے دل کی آنکھ سے دیکھا ہو۔

کہانی بعنوان ''مطلب کیا؟'' پڑھتے ہوئے مزید حیرت ہوئی کہ بچپن میں دیکھے ہوئے سلطان آباد کے میلے کی ایک ایک چیز انہیں ازبر ہے۔ یہ میلہ ہر سال پھاگن کے مہینے میں بڑی آن بان سے لگتا ، دور دور سے عقیدت مند حاضری دیتے ، پہلا دیا گدی نشین جلاتا اور اگر وہ بجھ جاتا تو اسے بدشگونی سمجھا جاتا اور وہ نہ بھی مرتا تو دربار کے لواحقین اسے زبردستی مار ڈالتے۔ جیسے جان فریزر کی گولڈن بو (Golden Bough) کی ایک اساطیری رسم میں بادشاہ کو ایک خاص مدت کے لیے چنا جاتا پھر قتل کر دیا جاتا تھا۔

میلے کی گہما گہمی، عقیدت مندی کے مظاہرے، آتش بازی، کھیل تماشے، سرکس کی پینگھیں جھولتی نازک اندام لڑکیاں جو ربڑ کی بنی ہوئی معلوم ہوتیں۔ کبڈی کے

مقابلے، تھیٹروں کے باہر بانسوں کی مچانوں پر رنگین کپڑے پہن کر رقص کرتے مرد اور خواجہ سرا، احمد کبیر کا اپنے خاص دیہاتی انداز میں کرسی پر جوتے اتار کر اور ٹانگیں سینے سے لگا کر بیٹھنا، اپنی پگڑی کو رسی کی طرح کمر اور لاتوں کے گرد باندھ لینا اور کے ٹو کے سگریٹ کو ہاتھ کی مٹھی بنا کر چھنگلی انگلی میں پھنسا کر حقے کی طرح زور کا کش کھینچنا اور ویلیں ہونے والے سے اپنا نام سن کر خوش ہونا۔ ان سب جزیات کے ساتھ لگتا ہے ہم خود میلے میں ہیں یا اس کی فلم دیکھ رہے ہیں۔ زندگی سے چھلکتے اس میلے میں احمد کبیر کی آنکھ سے کہانی کار نے بڑے دلچسپ اور حیرت انگیز مناظر دیکھے اور دکھائے ہیں۔ اس کا کبڈی کا مقابلہ جیتنا اور انعام حاصل کرنا، ہر لمحے اپنی بھاگ بھری کی کمی محسوس کرنا، مجمع باز کا جمورے سے مکالمہ، بکھی واس عورتوں کا کھلونے بیچنا اور ٹھگ بازوں کے سیدھے سادے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے طریقے۔ غرض یہ کہ ممتاز حسین میلے کی ایک ایک چیز دیکھتے اور دکھاتے چلے جاتے ہیں اور یقین نہیں آتا کہ انہیں ان میلوں ٹھیلوں سے جدا ہوئے زیادہ عرصہ گزرا ہوگا۔

''بزمِ کہسار'' پڑھتے ہوئے ہم بالکل ایک نئے موضوع سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایک شخص کی نفسیات میں چھپی ہوئی بچپن کی ایک محرومی کہ اس نے ماں کو دیکھا نہ اس کی گود میں کھیلا، اس کے ساتھ ہی پل کر جوان ہو جاتی ہے۔ اگر ماں مر چکی ہوتی تو شاید اسے صبر آ جاتا مگر وہ اس کے باپ کو چھوڑ کر چلی گئی اور کسی دوسرے شخص سے شادی کر لی۔ افسانے کا قضیہ یہ نہیں ہے کہ ماں باپ کی باہمی ناچاقی اور علیحدگی کا ذمہ دار کون تھا؟۔ غلطی ماں کی تھی یا باپ نے زیادتی کی کہ دو ماہ کا بچہ چھین کر اپنی بہن کے حوالے کر دیا اور اگرچہ اس کی پھوپی نے اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر وہ ماں کی کمی کو تو پورا نہیں کر سکتی تھیں۔ اب اس بچے کا مسئلہ یہ ہے کہ ماں سے بچھڑ کر وہ چالیس برس کا ہو گیا ہے اور اسے ہر آن ماں کی گود سے محرومی کا احساس ستاتا رہتا ہے۔ وہ زندگی کے

کسی بھی چھوٹے بڑے کام میں ناکام ہوتا ہے تو یہی سمجھتا ہے کہ ماں کے دودھ کی کمی کی وجہ سے ایسا ہوا۔ وہ اس کمی کو مصنوعی طریقے سے دور کرنا چاہتا ہے لیکن ایسا ممکن نہیں۔ اگرچہ ہر مرد کے اندر ایک بچہ ہمہ وقت موجود ہوتا ہے۔ وہ ماں کو بیوی میں بھی تلاش کرتا ہے مگر بیوی یا کوئی دوسری عورت ایک چالیس سالہ مرد کی ماں بن سکتی ہے نہ وہ مرد ایک بچہ۔ ہر عمر کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ فریق مخالف کے رویے میں تبدیلی ایک فطری ردعمل ہے۔ یہ ایک عجیب اور نفسیاتی تھیم رکھنے والی کہانی ہے۔

''شاپنگ مال'' بھی ایک دلچسپ کہانی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر طبقے کی معاشرت اور اس کے کرداروں کے بارے میں مصنف کی معلومات خاصی ہیں۔ انہوں نے ایک بگڑے رئیس زادے کی ضد، غرور اور بدتمیزی کی بڑے موثر انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ اس کلاس کا معاشرہ واقعی شاپنگ مال کی حیثیت رکھتا ہے جہاں ہر چیز خریدی اور بیچی جاتی ہے۔ دولت کی بے انتہا نمائش اور اصراف کے بعد جو شخص دودھ پلائی کی رسم کے بھی پچیس لاکھ ادا کر سکتا ہے، وہ شوہر سے زیادہ تماش بین ہی تو ہے۔

لب فرات ایک مختلف ذائقے کی کہانی ہے۔ دراصل یہ کل اور آج کے یزیدوں کی کہانی ہے کل اگر وہ پانی پر پہرے بٹھا کر اہل کربلا کو تشنگی سے دوچار کرتے تھے تو آج اپنی ملوں کو بچانے کی خاطر بستی کو غرق کرنے سے باز نہیں آتے۔ طالب جوگی اور بھٹیارن کے کرداروں سے سیٹھ کے کردار کا تقابل کرنے سے مظلوم اور ظالم کا فرق مزید عیاں ہو جاتا ہے۔ بھٹیارن تو صبر و رضا کا استعارہ ہے اور طالب جوگی سات محرم کے جلوس کے لیے میٹھے پانی کی سبیل کی خاطر ملنے والے چندے سے کتنا بچا لے گا؟۔ زیادہ سے زیادہ چٹنی یا پیاز کی بجائے ایک دو روز سالن کے ساتھ روٹی کھا لے گا۔ مگر مل اونر؟۔ بس یہی ایک سوال پڑھنے والے کو لب فرات لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے۔

''حاملہ موت'' ایک بے نوا اور بے کس شخص کی کہانی ہے جو کینسر جیسے موذی مرض

میں مبتلا ہو گیا اور جب اذیت نا قابل برداشت ہو گئی تو خودکشی کی خاطر سانپ سے ڈسوانے گیا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک کرشمہ جنم لیتا ہے اور اس کی بیماری دور ہو جاتی ہے۔ قدرت کے مخفی بھیدوں کو کون جان سکتا ہے۔

''میلی جنت'' موجودہ دور کی انتہا پسندی اور خودکش دھماکوں کے پس منظر میں لکھی ہوئی کہانی ہے۔ مسجدیں جو خدا کا گھر اور محفوظ ترین جگہیں تھیں، اسلحے اور شدت پسندی کے مراکز بنتی جارہی ہیں۔ کم علم مذہبی رہنما اور بے مغز نوجوان شہادت اور جنت کی بشارت کے بے تعبیر خوابوں میں گم ہونے اور خودکش حملوں کے ذریعے اسلام جیسے سلامتی کے دین کی بدنامی کا سبب بننے لگے۔ انداز بیان اچھا ہے۔

انسانی بدن کی جمالیات کے حوالے سے مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا ردعمل اور نقطہ نظر مختلف ہوتا ہے۔ تانیہ میڈیکل کی طالبہ ہے اور انسانی بدن کو اناٹمی کے نقطہ نظر سے دیکھتی ہے کہ اس میں کتنے جوڑ ہیں چلتے یا کام کرتے ہوئے کون کونسے مسلز کس طرح کام کرتے ہیں وغیرہ۔ اس کے مقابلے میں علی بابا ایک مصور ہے۔ اسے حسین بدنوں کی ڈرائنگ سے دلچسپی ہے۔ انسانی بدن کو وہ ایک خاص ماپ، تناسب اور قوسوں کے حوالے سے حسین قرار دیتا ہے۔ اسے ایک ایسے ماڈل کی تلاش ہے جو اس کے تخیل کو حقیقت میں بدل دے۔ اس کے خیال میں تانیہ ہی وہ ماڈل ہے مگر وہ برہنگی کو آرٹ کی بجائے دینی اور اخلاقی نقطہ نظر سے دیکھتی ہے۔ لیکن ماحول کی تبدیلی کے ساتھ اس کے خیالات میں بھی حقیقت پسندی آجاتی ہے اور دونوں اپنی اپنی منزل کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔

''موت کی زندگی'' اور ''برہنہ شہد'' دونوں نئی تکنیک اور اسلوب میں لکھی جانے والی نیم علامتی نیم انشائی کہانیاں ہیں اور کہانی کار کی زبان و بیان پر دسترس کا ثبوت ہیں۔ ان کہانیوں کے موضوعات سے زیادہ مجھے ان کے شگفتگی کے پہلو اور بے تکلفی کے

لہجے نے متوجہ کیا۔ جس سے کہانیوں میں دلچسپی اور ریڈا ایبلٹی کی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے:

☆ لائبریرین کے سر کے اوپر علامہ اقبالؒ کا فریم کیا ہوا چہرہ جو اپنے فلاسفر کھٹنے کے سہارے اونگھتا ہوا چپڑاسی کو یہ کہہ دیتا۔ کبھی میرا پورٹریٹ بھی سال میں ایک بار دھو دیا کرو۔

☆ حاجی صاحب ڈسپنسری بھینس بھی وہیں بندھی تھی اور بھینس کے ساتھ JD-29 بھی وہیں کھڑی ہوتی تھی۔ یہ ٹیوٹا کرولا کی نمبر پلیٹ نہیں تھی، حاجی صاحب کی گدھی کے بائیں کولہے پہ لوہے سے جلے ہوئے نمبر کا نشان تھا جو محکمہ حیوانات کے ریکارڈ کے لیے جانور شماری کے کام آتا۔ جب کسی کو دولتی پڑتی محلے کے لڑکے کہتے JD-29 کا ٹائی راڈ کھل گیا ہے۔

☆ مکڑی ہرروز رومیو جولیٹ کتاب کے پیچھے مکڑے سے ملنے آجاتی۔ دوستی حد سے بڑھنے لگی تو تکلف کا ذوق شرافت کی حدوں کو پار کرنے لگا۔ ایک دن گھنگھور گھٹا لہرائی، بادل گرجے تو مکڑے نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

☆ خارشی کتا کئی دنوں سے بھوکا اس انتظار میں تھا کہ شاید قصائی یہ بکرا صاف کر کے کوئی چھیچھڑا میری طرف پھینک دے گا۔ لیکن بدقسمتی سے مہنگائی نے لوگوں کو مٹن کڑاہی کی بجائے چھیچھڑا کڑاہی کی عادت ڈال دی تھی۔

''حجر کی آنکھ میں بحر اسود'' اپنے عنوان کی طرح یہ کہانی بھی دلچسپ اور انوکھی ہے۔ بے شک اس خیال پر پہلے بھی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں کہ کسی مفلس و نادار کی مدد کرنے اور نیکی کے کام کے لیے حج کی رقم خرچ کر دینے سے گھر بیٹھے حج کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے لیکن جس موثر اور اچھوتے انداز میں ممتاز حسین نے دروازے اور خط کو قوت گویائی دے کر کہانی بُنی ہے وہ بے حد خوبصورت ہے۔

میں سمجھتا ہوں۔ ممتاز حسین ایک جدید اور بین الاقوامی شہرت کے مالک آرٹسٹ

اور مصوری نہیں وہ اردو کہانی کا بھی بہت عمدہ ذوق رکھتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے کہانی کاری میں بھی اپنے فن کی مہارت سے کام لیا اور لفظوں سے زندہ اور محاکاتی تصویریں تخلیق کی ہیں۔ان کی کہانیاں اسلوب ،مواد(content) اور اثر پذیری ہر لحاظ سے پڑھنے والوں میں مقبول ہوں گی ۔ ۔میں وطن سے دور رہ کر وطن کی مٹی سے اس قدر پیار کرنے اور فنون لطیفہ کے مختلف شعبوں میں اعلیٰ کارکردگی پر انہیں مبارک باد دیتا ہوں اور ان سے توقع کرتا ہوں کہ وہ اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے کہانی پڑھنے اور لکھنے کے کام کو فراموش نہیں کریں گے۔

میں ان کی تخلیقی توانائی کے لیے دعا گو ہوں۔

منشایاد

۲۸ مئی ۲۰۱۰ء_اسلام آباد

لبِ فرات

انجمن غلامانِ مصطفیٰ۔

طالب جوگی کے بازو پہ بندھی ہوئی کالی پٹی کو پڑھ کر بنگلے کے مالک نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا "فرمایئے۔"

بس کیا بنگلہ تھا۔ محل کا محل تھا۔ باہر دو ستون۔ دو ستونوں کو ملانے والا بڑا گیٹ۔ بڑے گیٹ کے اندر چھوٹا گیٹ جس سے ہر کوئی سر جھکا کے گزرتا۔ ایک ستون پہ سیمنٹ کے اندر کھدا ہوا کتبہ۔ جس پہ باغِ فدک لکھا تھا۔

طالب جوگی نے بڑی عاجزی سے سات محرم کے جلوس میں میٹھے پانی کی سبیل کے لیے چندہ کا مطالبہ کیا۔

"حضور اس دفعہ محرم بھی جون کے مہینے میں ہے۔ انتہا کی گرمی ہے۔ عزاداروں کے ننگے پاؤں، بس کربلا کی تپتی ریت انگاروں پہ ماتم کے مترادف ہے۔"

مالک نے پوچھا "ہاں ہاں فرمایئے کتنے پیسے چاہئیں؟" طالب جوگی نے چندہ کی رسید کی کاپی بنگلے کے مالک کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بس دیکھ لیجیے۔ ہماری انجمن کبھی میٹھے پانی میں سکرین کا استعمال نہیں کرتی۔ ولایتی چینی کا روح افزا والا پانی ہوتا ہے۔ اور ہمارے کارکن سارے جلوس پر روح کیوڑے

کی فوار بھی چھڑکتے ہیں۔"

''بس بس زیادہ تمہید کی ضرورت نہیں۔ کتنے پیسے چاہئیں؟'' طالب جوگی نے رسید کی کاپی ہاتھ میں تھماتے ہوئے انکساری سے کہا۔''بس اس رسید کی کاپی میں اپنی مرضی سے لکھ دیں۔''

باغ فدک نامی بنگلے کے مالک نے رسید کی کاپی بغیر کچھ لکھے واپس کردی اور اپنی کالی قمیص کی بائیں طرف چاک والی اندرونی جیب سے بڑی نوٹوں والی گٹھی نکال کر طالب جوگی کو دیتے ہوئے کہا۔

''مولا کے نام کی سبیل ہے۔ مجھے رسید کی ضرورت نہیں ہے۔'' طالب جوگی نے جھک کر سلام کیا۔اور جوش میں کہا۔

''پانی پیو تو یاد کرو پیاس حسینؓ کی۔''

بنگلے سے باہر نکلنے سے پہلے وہاں کھڑے چوکیدار سے پوچھا۔

''صاحب کا کاروبار کیا ہے۔''

چوکیدار نے حیران ہو کے جواب دیا۔

''آپ کو نہیں پتا۔صاحب کی دو ملیں جو شہر کے باہر بند ہے،اس طرف ہیں۔''

طالب جوگی نے جواب دیا۔''اچھا اچھا وہ بند والی دو نئی ملیں صاحب کی ہیں۔''

دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔طالب جوگی کا سارے دن کا کام، بنگلے کے مالک نے لمحوں میں تمام کر دیا۔سید حابستی کی بھٹیارن کے ہاں گیا۔یہ بھٹیارن دوپہر اور شام کو تندور بھی لگاتی تھی۔دوپہر اور شام کے کھانے کے درمیان اسی تندور پر کڑاہی چڑھا کر گرم ریت میں دانے بھون کر اور روٹیاں لگا کر گزر بسر کرتی تھی۔تندور والی زمین اس کی اپنی نہیں تھی۔سبزی منڈی کے ایک آلوؤں کے آڑھتی کا خالی پلاٹ تھا۔جس کا پچھلے بارہ سال سے دیوانی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔لیکن آڑھتی نے وہ جگہ اسے تندور لگانے کے لیے دے رکھی

تھی۔ جس پر مخالف گروپ جل کے کہتا تھا آ زحتی نے خالی پلاٹ بھٹیارن کو جہیز میں دیا ہے۔ لیکن تندور سے سات گھر چھوڑ کے بڑے کیکر کے درخت والا کچا مکان بھٹیارن کا اپنا تھا۔ بڑا پیار تھا اسے اس مکان سے۔ پائی پائی جمع کر کے اس نے دو مرلہ زمین خریدی تھی۔ لیکن خالی زمین سے ضروری کچا کوٹھا تھا۔ جس میں وہ اپنا سر چھپا سکتی تھی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ اُس کا خاوند سیلاب میں ڈوب مرا تھا۔ جب بھی گرمیوں میں پہاڑوں پہ برف پگھلتی تو پورا علاقہ سیلاب کی زد میں آ جاتا۔

لیکن گزشتہ کئی سالوں سے بستی محفوظ تھی۔ کیونکہ شہر کے لوگوں نے اب بہت بڑا حفاظتی بند پانچ میل کی لمبائی میں شہر اور سیلاب کے درمیان باندھ دیا تھا۔ جو دیوار چین بن کر شہر کی حفاظت کرتا۔ شہر سے پہلے اور بند کے قریب یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ ویسے بھی کافی سالوں سے موسمی تبدیلی کی وجہ سے دریاؤں میں طغیانی کی شرح بہت کم تھی۔

قدرت کا بھی اس علاقے سے عجیب وغریب مذاق تھا۔

بارش نہ ہوتی تو فصل اچھی نہیں ہوتی تھی۔ بارش زیادہ ہوتی تو سیلاب تباہی مچا دیتا تھا۔ اللہ کے فضل سے شہر کئی سالوں سے تباہی سے بچا ہوا تھا اور حفاظتی تدابیر بھی خاصی کارگر ثابت ہوئی تھیں۔

طالب جوگی عموماً بھٹیارن سے روٹیاں خرید لیتا تھا اور گھر لے جا کر کبھی سالن، کبھی اچار، اگر سالن اور اچار نہ ہوتا تو خربوزے کی پھانکوں کو روٹی کے نوالے میں لپیٹ کر اپنے کھانے کا بندوبست کر لیتا۔ طالب جوگی کوئی باقاعدہ کام نہیں کرتا تھا۔ بس مذہبی تہواروں پہ پانی کی سبیلوں کے چندوں سے پیسے بچا کر اور نیازوں کا بچا ہوا کھانا اس کے گزر بسر کے لیے کافی ہوتا تھا۔ طالب جوگی کو جلدی واپس آتا دیکھ کر بھٹیارن کچھ حیران ہوئی۔

''ہائے طالبو! آج جلد ہی لوٹ آئے۔''

''ہاں ایک ہی مولا کے نام لیوا نے سب کا چندہ پورا کر دیا۔''

طالب جوگی نے جواب دیا اور ایک ناموزوں سا سوال سوچ کے پوچھا۔

''اس تندور والی زمین کے کیس کا کیا ہوا۔ جو مخالف گروپ کہتا ہے یہ تمھیں جہیز میں ملی ہے۔''

بھٹیارن نے بغیر سوچے جواب دیا۔

''میرا کیس سے کیا تعلق۔ مجھے کوئی تندور لگانے دے گا تو بھوکے لوگوں کو روٹیاں مل جائیں گی۔ یہ تو اللہ کی زمین ہے۔ ناسمجھ لوگ حرص کے لوبھی ہیں۔ خواہ مخواہ لڑتے جھگڑتے ہیں۔''

طالب جوگی کی آنکھوں کے سامنے دو بڑے ستون، ستونوں کے درمیان بڑا گیٹ، بڑے گیٹ کے اندر چھوٹا گیٹ جس میں سب لوگ جھک کر گزرتے تھے۔ ایک ستون پہ سیمنٹ میں کھدے باغ فدک کے کتبے کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔

''تب تو اس جگہ کا نام باغ فدک ہونا چاہیے۔''

''کیا''...... بھٹیارن کو کچھ سمجھ نہیں آئی۔

''پتا نہیں تم کیا کہتے رہتے ہو، میری سمجھ سے باہر ہیں تمہاری باتیں۔''

''یہ بتاؤ روٹیاں کتنی لو گے؟''

طالب نے جواب دینے کے بجائے سوال پہ سوال کیا۔

''تمھیں گرمی نہیں لگتی؟ آگ کے اوپر بیٹھتی ہو۔''

بھٹیارن نے لمبی سلاخ سے جس کا دوسرا کونہ سوالیہ نشان کی طرح مڑا ہوا تھا۔ روٹی تندور کے اندر سے اٹھائی اور جواب دیا۔

''یہ گرمی کربلا کی گرمی سے کم نہیں جب پیاس لگتی ہے پانی پی لیتی ہوں۔ اور جب میں اس سلاخ کو تندور کی آگ میں جھک کر روٹیاں اٹھاتی ہوں تو اوپر سے پڑنے والی گرمی مجھے جنت کی ٹھنڈی ہوا لگتی ہے۔ جب تندور کے پیٹ میں جلتی ہوئی آگ سے لوگوں کے

پیٹ کی آگ بجھاتی ہوں تو لوگوں کی دعاؤں سے میرے بہشتی خاوند پہ خداوند تعالیٰ کریم اپنی رحمت کے ائر کنڈیشن کی ٹاکیاں کھول دیتا ہے۔ تو میرا خاوند مجھے خوابوں میں آ کے بتاتا ہے۔

''تو لوگوں کو روٹیاں کھلایا کر۔ اللہ کریم و تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کے زردے، پلاؤ کھلاتا ہے۔ تو طالبو یہ آگ کے انگارے مجھے گلاب کے پھول لگتے ہیں۔ لے پھڑ روٹیاں۔ اج مجھے پیسے نہ دینا۔''

طالب جوگی جیسے مقابلے پہ اتر آیا ہو۔ ''ہاں ہاں میں بھی تو پیاسوں کو ٹھنڈا اور میٹھا شربت پلاتا ہوں۔ سات محرم کی شام کو سبیل کے پانی کا پورا جگ لے آؤں گا۔''

بھٹیارن نے دو روٹیاں اسے لپیٹ کر دیں۔

''پانی تو تم مجھے سات محرم کو پلاؤ گے۔ لو روٹیاں اب کھاؤ۔''

طالب جوگی نے کندھے پر پڑے ہوئے رومال میں روٹیاں باندھ لیں۔ ساتھ بیٹھی ہوئی ایک عورت نے طالب جوگی کے کندھے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

''کچھ سنا ہے۔ سیلاب کا پانی بند کو آن لگا ہے۔''

طالب نے اس خبر پہ کچھ زیادہ توجہ نہ دی۔

''تو وہ تو ہر سال گرمیوں میں پانی بند کو آن چھوتا ہے۔''

عورت نے اپنی خبر پہ زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن اس دفعہ سیلاب کے تیور کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔''

طالب نے پھر لاپرواہی سے جواب دیا۔

''چلو فکر نہ کرو۔ رات کو مجلس کے بعد ذاکر سے دعا کروا دوں گا۔''

محرم کی تیاریاں زور شور سے تھیں۔ طالب جوگی نے بھی سبیل کے لیے سودا سلف خریدا۔ سب رضا کاروں کو اکٹھا کیا چھوٹے بچے بڑے جوش و خروش سے سبیل کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان کا لیڈر طالب جوگی سب کو کالے رنگ کی پٹیاں تقسیم کرتا۔ جن پر انجمن

غلامان مصطفیٰؐ لکھا ہوتا۔

اس دفعہ تین کے بجائے چار ریڑھیوں کا بندوبست کرلیا۔ ہر ریڑھی پہ دو پانی کے ٹب۔ ریڑھی کے اندرونی خانے میں برف کی بہت بڑی اینٹ لکڑی کے بورے سے ڈھنسی ہوتی تا کہ گرمی اسے پگھلا نہ سکے۔ برف تو وہ سات محرم کو ہی خریدتا لیکن لکڑی کا بورا وہ پہلے ہی لکڑی کے کارخانوں اور ترکھانوں سے اکٹھا کر لیتا۔ ابھی سات محرم میں سات دن باقی تھے سب رضا کاروں کے گھر ہدایات کے بہانے فرداً فرداً ہر روز جاتا۔ اسی بہانے وہاں سے کھانا بھی مل جاتا۔ اسی لیے کافی دنوں سے تندور پہ جانے کا اتفاق نہ ہوا۔

لیکن بھٹیارن کو سیلاب والی خبر اندر ہی اندر سے ڈرائے جا رہی تھی۔ ہر روز گھر کے صحن میں کیکر کے درخت کی جانچ پڑتال کرتی رہی۔ اسے نہ جانے کیوں اس بات پہ یقین تھا۔ چیونٹیوں کو سیلاب کی اطلاع پہلے سے مل جاتی ہے۔ وہ خود اتنی مصروف تھی کہ حفاظتی بند پہ جا کے سیلاب کے پانی کا اندازہ لگا سکے۔ ہر روز تندور پہ آنے جانے والے سے پوچھتی۔ پتا چلاتی رہتی کہ پانی کہاں تک پہنچا ہے۔ اسے سیلاب سے بہت ڈر لگتا تھا۔ جب سے اس نے اپنا کوٹھا چھتا تھا۔ وہی اس کے سر چھپانے کا سہارا تھا۔ پہلے تو وہ اپنے خاوند کے ساتھ اس کے رشتے داروں کے ہاں چلی جاتی تھی۔ خاوند کے مرنے کے بعد اسے سیلاب اور بھی خوفناک لگتا تھا۔ لیکن پانی نے بھٹیارن کے خوف کی پروا کیے بغیر بند پہ لگے ماپنے کے نشان پر اپنا قد بڑھانا شروع کر دیا۔

ادھر طالب جوگی کی سبیل لگانے کی کاوشوں نے اپنا ہاتھ بڑھانا شروع کر دیا۔ سیلاب کے پھیلاؤ کی بھی اطلاع اسے برابر ملتی رہی۔ لیکن وہ فکرمند نہیں تھا کیونکہ سات محرم کا جلوس سیلاب کی پہنچ والے مقامات سے بہت دور تھا۔

چھ محرم کی سہ پہر انجانے ڈر نے بھٹیارن کو آ لیا اور وہ جلدی کام چھوڑ کر گھر آ گئی۔ صحن میں لگے کیکر کے درخت کو دیکھ کر اس کا دل دہل گیا۔ کیونکہ چیونٹیوں کی ایک لمبی قطار

کھانے کے ذرّے اٹھائے کیکر پر چڑھی جا رہی تھی۔ بھٹیارن کو بھی یہ خیال اچھا لگا۔ کیوں نہ میں یہ اپنا قیمتی سامان کیکر پہ باندھ دوں۔ لہٰذا اس نے اپنا قیمتی سامان ایک ٹرنک میں بند کیا۔ قیمتی سامان بھی کیا تھا۔ دو چار کپڑے، کچھ زیور جو اسے جہیز میں ملا تھا۔ یہی چیزیں اس کے خاوند کی نشانی تھیں۔ ٹرنک کو کیکر پہ چارپائی کی مدد سے چڑھا کر مضبوط تنے سے باندھ دیا۔

سات محرم کا دن تھا۔ جلوس اپنے جوش و خروش سے شہر کے بڑی امام بارگاہ سے نکلا۔

ادھر سیلاب کا پانی بھی اپنے پورے جوش و خروش سے حفاظتی بند سے پوری آب و تاب سے ٹکریں مارنے لگا۔

جلوس نکلنے سے پہلے ذاکر نے بڑے جوش و خروش سے تقریر کی۔ امام حسینؑ کے سات محرم کے مصائب کا ذکر بڑے غمزدہ انداز میں کیا۔

''اے حسینؑ کے ماننے والو! آج یزید کی فوجوں نے دریائے فرات پہ پہرے بٹھا دیے۔ امام حسینؑ کے خیموں کو حُر اور شمر کی فوجوں نے گھیرے میں لے لیا تاکہ کوئی پانی نہ لے سکے۔ زینب نے اصغر کو روتے سُنا اور دیکھا تو اصغر کے ننھے ہونٹ پیاس سے خشک ہوتے جا رہے تھے۔ پانی کے لیے خیمے سے باہر نظر اٹھا کے دیکھا تو یزید کی فوجیں پانی اور خیموں کے درمیان بند باندھے کھڑی تھیں۔''

ذاکر صاحب نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے دوبارہ میر انیسؔ کا بند پڑھا۔

آمد اسی طرح رہی لشکر کی روز و شب
نرغے میں آ گیا پسر سید العرب
گرمی میں ساتویں سے ہوئی شدت تعب
پانی مسافروں پہ ہوا بند بے سبب

بند رباعی سنتے ہی جوش اور غم کی چیخیں جلوس سے نکلیں۔ ماتمیوں کے ہاتھ قطار میں ہوا میں اٹھے۔ اور نقارے کی چوٹ کی طرح سینوں پہ برسے۔

ادھر سیلاب کے پانی کی لہروں نے بند کے سینے کو تھپیڑوں سے پیٹا۔

طالب جوگی بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ ماتمیوں میں ٹھنڈا اور میٹھا پانی پلانے میں مصروف تھا۔

بار بار اس کی نظریں بنگلے کے مالک کو ڈھونڈھ رہی تھیں تاکہ اس کو دکھا سکے کہ کتنی محنت سے اس کی دی ہوئی چندے کی رقم حسین کی راہ میں کام آ رہی ہے۔ لیکن وہ تو آج جلوس میں آیا ہی نہیں۔ وہ اپنے بنگلے میں بیٹھا پریشان تھا کیونکہ سیلاب کا پانی اپنی حدوں سے تجاوز کر گیا تھا اور بند کی طرف اس کی ملیں تھیں تو اونچائی پر لیکن پانی ملوں پر چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ ملوں کو بچانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ بند کو اڑا دیا جائے تاکہ پانی بستی میں پھیل جائے اور ملوں کے اندر نہ پہنچ پائے لہٰذا اس نے اپنی طاقت اور اثر و رسوخ سے شہر کے ڈپٹی کمشنر کو راضی کر لیا۔ ملک کی معیشت کا بچاؤ زیادہ ضروری ہے۔ بستی کا کیا ہے وہ تو پہلے غریبوں کی کچی آبادی ہے۔ ملوں کا نقصان خاصا بھاری ہے لہٰذا بند کو بم سے اڑا دیا گیا۔ سیلاب کے پانی نے بستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

بھٹیارن کے مکان کی کچی دیواروں میں دراڑیں ڈالنے کے لیے سیلاب کو کچھ زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ پانی دیواروں سے یوں ٹکریں مار رہا تھا جیسے طالب جوگی لوہے کے سوئے سے برف کو توڑ رہا ہو۔ بھٹیارن کا کوٹھا، طالب جوگی کے سبیل کے پانی کی طرح برف اور ولایتی چینی کی طرح پگھلنے لگا اور دھم سے کچا کوٹھا سیلاب کے پانی میں گھل گیا۔

بھٹیارن بے بسی میں چارپائی کی مدد سے کیکر پہ چڑھ گئی اور زور زور دار آواز سے مدد کے لئے پکارنے لگی۔

یزید...... یزید...... یزید

ہے کوئی یزید جو مجھ پہ پانی بند کرے۔

☆☆☆

گوشت پوست کی مونالیزا

انارکلی میں پھلوں کی چاٹ کی دکان کے ساتھ جڑے ہوئے لکڑی کے کیبن جو گلی میں کھلتے تھے چھوٹے سے کیبن میں چھوٹی سی میز کے دونوں طرف دو بنچ جڑے ہوتے۔ تنہائی کے لیے کیبن پہ پردہ لٹک رہا ہوتا جو گلی میں سے گاہک آ کے آسانی سے کہیں بھی بیٹھ سکتے۔ انارکلی کو چاروں طرف سے کالجوں اور یونیورسٹیوں نے گھیرا ہوا ہے۔ ایک طرف پنجاب یونیورسٹی کا اولڈ کیمپس ہے تو دوسری طرف گورنمنٹ کالج، لاء کالج، آرٹ کالج سے لے کر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے علاوہ ان گنت چھوٹے چھوٹے کمپیوٹر سیکھنے، زبان سیکھنے کے علاوہ کاریگری کے سنٹر۔ اسی لیے لاہور کو کالجوں کا شہر کہتے ہیں۔ اس نسبت سے انارکلی تو سب سکولوں اور کالجوں کی منڈی بنی ہوئی ہے۔ دوپہر کے کھانے کے دوران تمام ریسٹورنٹ سے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور سڑک کے کنارے دال چاول کے پتیلے والوں کے گرد بھی بھیڑ ہوتی ہے اس بھیڑ کو کاٹتے ہوئے تانیہ نے بھی دوپہر کے کھانے کا ارادہ پھلوں کی چاٹ سے کیا۔ دکان کے کاؤنٹر پر چاٹ کا آرڈر دے کر وہ چھوٹے سے کیبن میں بیٹھ گئی۔ لڑکے نے فوراً چاٹ کی پلیٹ رکھتے ہوئے کہا۔ ''پی پی جی جوس بھی پئیں گی یا ملک شیک۔''

اس نے لڑکے سے پوچھا جوس میں کیا ورائٹی ہے۔ لڑکے نے جوسوں کے نام گنوا دیے۔ انار کے جوس کے اجزا انسبتاً زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا اُس نے انار کے جوس کا کہا تھا باقی جوسوں سے کچھ مہنگا تھا تو طے کر لیا کہ بس یہی دوپہر کے کھانے کے لیے کافی ہے۔ ورنہ بجٹ میں کمی بیشی ہو جائے گی۔ کیونکہ انار کے جوس کی قیمت پورے لنچ کے برابر تھی۔ لڑکا تھوڑی دیر میں جوس کا گلاس رکھ کر پردے کو بند کر کے واپس چلا گیا تو کیبن کے پردے کا ایک چوتھائی حصہ کھلا رہ گیا۔ اس میں سے گزرتے لوگوں کی جھلک تانیہ کی توجہ کا مرکز بنی۔

کوئی موٹا، کوئی چھوٹا، کوئی لمبا، کوئی ٹھگنی...... ایک بہت ہی خوبصورت عورت کی جھلک دکھائی دی تو تانیہ نے اپنے سر کو پردہ سے باہر نکال کر دیکھنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ اُسے پوری طرح دیکھ نہ پائی۔ فوراً انار کا جوس جو چسکیاں لے کے ختم کرنے کا ارادہ تھا، ایک ہی گھونٹ میں سارا جوس ایسوفیگس سے ہوتا ہوا جسم کے مین ہاضمے کی ٹیوب میں جمع ہو گیا۔ خوراک کے سارے اجزا کڈنی لیور اسمال انٹسٹائن اور چھوٹے انٹسٹائن میں چلے گئے اور کچھ بلیڈر میں رک گئے۔ جلدی سے خوراک کی جمع تفریق میں پیسے بھی گنے اور دکاندار کو دے کے فوراً خوبصورت عورت کے تعاقب میں نکل گئی۔ اس عورت کے جسم کی تعمیر کو بھانپنا شروع کر دیا۔ ابتدائی حصے سے دیکھا جائے تو ایک سیل پھر اس سے ملے ہوئے بہت سے سیل ان کی جمع الجمع سے ٹیشوز اور جسم کے میٹریل کے ملاپ سے آرگن، تمام آرگن انسانی مشین کے پرزے۔ یہ پرزے جو انسان کو چلانے اور خون کی گردش جسمانی سسٹم کو ایک مکمل گھومتے پھرتے مجسم میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

تانیہ نے لمبے لمبے قدم اٹھا کر خوبصورت عورت سے آگے نکل کر سڑک کے کنارے دکانوں کے باہر لٹکے ہوئے دوپٹوں کو دیکھنے کے بہانے اس خوبصورت عورت کو بڑے غور سے دیکھ کر اس جسم کے ڈھانچے کی تقسیم کو گننا شروع کر دیا۔ 206 مختلف سائز کی ہڈیوں سے جڑا ہوا ڈھانچہ۔ ہر ہڈی کا ملاپ دوسری ہڈی سے جو اس کی چال ڈھال میں

آگے بڑھنے میں مدد دے رہا تھا۔ ہڈیوں کی تقسیم تو اس کی سمجھ میں آ گئی۔ لیکن اس کی ادا، پاؤں اٹھانے کا طریقہ اور مناسبت سے سر کو گھما کے دیکھنے میں جو کشش تھی وہ کچھ سمجھ سے باہر تھی۔

اس کی نقل میں جب اُس نے اپنا ہاتھ ویسے ہی اٹھایا تو کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر پڑی تو فوراً پریشانی نے آ لیا۔ اناٹمی کی کلاس میں دیر ہو گئی ہے فوراً نیلے گنبد سے شارٹ کٹ لگا کر کنگ ایڈورڈ کالج کے مین گیٹ سے بھاگتی ہوئی کلاس میں پہنچی تو ٹیچر گراس اناٹمی پہ لیکچر دے رہا تھا۔ لیکچر کے بعد انسانی جسم کی ڈائی سیکشن تھی۔ یعنی مردہ انسان کی باقاعدہ تحقیق کرنی تھی۔ انسانی ڈھانچہ پہ مسلز کیسے اور کہاں چڑھتے ہیں۔ ڈھانچہ خاص ترتیب سے دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک لکیر ڈھانچے کو درمیان میں دائیں اور بائیں حصے میں بانٹتی ہے۔ ان کے درمیان کھوپڑی، ریڑھ کی ہڈی، پسلیاں، چھاتی کی ہڈیاں، یہ تمام ہڈیاں جسم کی حفاظت کرتی ہیں خاص طور پر دماغ کی جو جسم کا خاصا حساس حصہ ہے۔

اس لیکچر کے دوران تانیہ کو ٹیچر یوں لگا کہ جیسے ٹیچر کے جسم کی ہڈیوں میں انتڑیاں اور رگیں یوں لپٹی ہیں جیسے کسی درخت پہ چڑھی اکاس بیل نے سارے درخت کے تنوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ جتنی بھی وہ تحقیق کے مرحلے سے گزرتی اسے ہر ملنے والے شخص میں چمڑے کے مرتبان کے اندر رگوں اور انتڑیوں کا ایک نقشہ ابھرتا ہوا ملتا۔ ہر انسان اسے پلاسٹک کے مجسمے میں کسی کیمیائی عمل کی انرجی سے حرکت میں دکھائی دیتا۔ پھر اسے اپنی ہر حرکت کا عمل پریشان کرنے لگا۔ یعنی پانی کا گلاس اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس حرکت کا عمل کیسے پایہ تکمیل تک پہنچا۔ دماغ کے کس سیل سے پیغام ہاتھ کو پہنچا انگلیاں حرکت میں آئیں اور گلاس کو انگلیوں نے جکڑ لیا اور گلاس اٹھانے کا عمل پورا ہوا۔ یعنی نروز کے اشارے کو جسم کیسے کنٹرول کرتا ہے اور کیسے کیمیکلز جو ڈائریکٹ خون میں شامل ہو کر ایک خاص ٹارگٹ پہ وار کرتے ہیں اور حرکت کا عمل شروع ہوتا ہے۔ بلکہ کسی وجیہہ و شکیل مرد کو

دیکھنے کے بعد اس کا دماغ ایک عجیب تانا بانا بُننا شروع کر دیتا۔ ٹیوبز کی لمبی قطاروں میں سپرمز ہوتے ہیں مرد کے جنسی سپرم۔ ایک خاص حصے میں سفر کرتے ہیں۔ عورت اور مرد کے جنسی ملاپ سے کروڑوں سپرم ایک ٹیوب میں سے سفر کرتے ہوئے خاص ٹیوب کے راستے سے گزر کر عورت کے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں اور ہو سکتا ہے انڈے سے جا کر ملاپ کر کے ایک انسان کو وجود دے دیں۔ اسی طرح کی الجھنیں ثانیہ کو پریشان کرنے لگیں۔ وہ اپنے گرد ونواح میں کسی سے بات کرتی تو جب کوئی اپنی گفتگو میں میڈیکل کی ٹرمانالوجی کا استعمال کرتا تو پھر اُس کا دماغ الجھ جاتا۔ دماغ میں کسی اور کی زندگی ایک ناممکن سی موت لگتی۔ جب بھی ایسی سوچ آ گھیرتی تو وہ جھنجھلا کر دماغ کو جھٹک دیتی۔ لیکن انسانی جسم کی اناٹمی کی وجوہات اُس کا پیچھا نہ چھوڑتیں۔ اگلی کلاس جانوروں کی اناٹمی کی سنڈی تھی اور دلچسپ بات اناٹمی کا استاد کوئی ڈاکٹر نہیں بلکہ نیشنل کالج آف آرٹس کا ایک تعلیم یافتہ آرٹسٹ انسٹرکٹر تھا۔ وہ جانوروں کے جسم کے حصوں کی تصویریں تختہ سیاہ پر بنا کر عام لوگوں کی سی گفتگو کر رہا تھا۔ اس کے بتانے کے طریقے بڑے دلچسپ اور اناٹمی کی وجوہات کی ترتیب کو ثابت کرنے کے ثبوت نہیں تھے بلکہ جانوروں کے جمالیاتی حسن پہ گفتگو بہت دلچسپ تھی۔ کلاس ختم ہونے کے بعد ثانیہ نے جانوروں کے مصور سے چائے پینے کو کہا۔ تو علی بابا تیار ہو گیا۔ علی بابا کا حلیہ بہت ہی عجیب وغریب تھا۔ گھٹنوں سے پھٹی ہوئی جینز، بہت لمبی داڑھی سے چہرے کے خدوخال ذرا مشکل سے پہچانے جاتے تھے۔ چھوٹی سی ناک پہ دو رنگ کا چشمہ جس کا ایک بازو موٹے دھاگے سے کان پہ بندھا ہوا تھا۔

دونوں بڑی دیر حسن و جمالیات پہ باتیں کرتے رہے۔ ثانیہ نے اسے اور بھی دلچسپ پایا جب اس نے اپنے چہرے اور جسم کے بارے میں گفتگو کی۔ بہت بڑی داڑھی رکھنے کی وجہ بتائی کہ علی بابا کی ٹھوڑی بہت چھوٹی سی ہے۔ تو چہرے کی پروپورشن کو پورا کرنے کے لیے چھوٹی سی ٹھوڑی پہ بڑی داڑھی کا چڑھالینا بصری مناسبت کی کمی کو پورا کر دیتا ہے۔

کپڑوں کے سٹائل پہ بات چلی تو غربت کو اگر اپنا سٹائل بنالیا جائے اور پرانے کپڑوں پہ مختلف ڈیزائن کی کتریں ایک اچھوتا پن اپنے ہی سٹائل کی ایجاد ہے۔ جو منفرد ہے بجائے ڈیزائنروں کے مہنگے کپڑے سے اپنا ہی سٹائل ایجاد کرلو۔ جو منفرد بھی ہو تمہاری پہچان بھی۔ زندگی کے مستقبل کی بات چلی تو وہ حیران رہ گئی کہ علی بابا ایسے جسم کی ڈرائنگ کرتا ہے جو بالکل مدھو بالا کی طرح ہو۔ اس کے ریفرنس کے لیے پورٹ فولیو میں مدھو بالا کی تین ہزار تصویریں موجود تھیں۔ اُسے ایسے جسم کی تلاش ہے جو پرو پورشن میں شکل وشباہت میں برصغیر کی حسن کی دیوی سے مماثل ہو۔ علی بابا کو اس جسم کا تمام ماپ زبانی یاد تھا۔ ایسی ماڈل کی تلاش تھی جس سے وہ اپنے تخیل کو حقیقت میں ڈھال کے ایک شاہکار کی تخلیق کر لے۔ وہ ایسے جسم کی تلاش میں اپنی تنخواہ کا کافی سارا حصہ بازارِ حسن کی حسیناؤں کو برہنہ دیکھنے میں صرف کر دیتا۔ اُن کی ڈرائنگ کرتا اور صرف ڈرائنگ۔ اس کے علاوہ اسے کسی اور چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ جسم کے اس چیپٹر پہ باتیں کرتے کرتے جب بات مذہب کی سمت اختیار کر گئی، تو تانیہ نے بھرپور دلائل دیے۔ برہنہ عورت کی تصویر بنانا گناہ ہے یا کم سے کم ہمارے مذہب میں اس کی ممانعت ہے۔ علی بابا نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ پہلے تو آپ پینٹنگز کو ایک پیشہ قبول کریں۔ بالکل جیسے آپ انجینئر، وکیل، بنکرز یا کسی ڈاکٹرز کے پیشے کو پہچانتے ہیں۔ فنِ مصوری اور دوسرے پیشوں میں تعلیم کا عمل اور تربیت کی اہمیت کو پہچانیں۔ ان کے نتائج کے فوائد کتنی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا جسم کی سنذی کا علم کتنی حد تک ضروری ہے۔

اگر ڈاکٹر آپریشن کرتے ہوئے کسی صنفِ نازک کو برہنہ دیکھ سکتا ہے تو ایک مصور کو اپنے شاہکار کی تکمیل کے لیے اس کی اجازت کیوں نہیں۔ تانیہ بالکل علی بابا کی بحث سے متفق نہ ہوئی۔ ڈاکٹر تو زندگی بچاتے ہیں۔ اگر اس عمل میں انہیں کسی کو برہنہ دیکھنا بھی پڑے تو کوئی حرج نہیں۔ بالکل اسی طرح بہت ہی مجبوری کی حالت میں اگر حرام چیز کو کھالیا جائے

تو وہ حرام نہیں ہوتی۔ سب بحث مباحثے میں ایک دوسرے سے تو متفق نہیں ہوتے۔ لیکن دوستی کے بارے میں دونوں کی رائے متفقہ تھی۔ دوستی کا عمل پروان چڑھنے لگا۔ تانیہ علی بابا میں خاصی دلچسپی لینے لگی۔ اس کی ہر ممکن کوشش ہوتی کہ علی کے ساتھ وقت بیتے۔ لیکن علی بابا نے تانیہ کے ساتھ تعلق بس ایک رسمی حد تک ہی رکھا۔ اسے تانیہ کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی کا فقدان لگتا تھا۔ ویسے بھی علی بابا کو اپنے شاہکار کی تکمیل کے علاوہ عورتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ علی کم سے کم تر نظر آنے لگا اور پھر بالکل لاپتا ہو گیا اور تانیہ بھی میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے امریکا چلی گئی۔ لیکن اس کے ذہن کے کونے سے علی بابا کی باتیں اور سوکھی ہوئی ٹانگوں پر چڑھی ہوئی پھٹی نیلی پتلون نکل نہ سکی۔

ایک دن نیویارک میں سنٹرل پارک کے باہر گھوڑے بگھیوں کی لمبی قطار دیکھ کر اُسے لاہور کا طالب علمی کا زمانہ یاد آ گیا۔ گڑھی شاہو سے تانگے میں بیٹھ کر میڈیکل کالج تک سواریوں کے ساتھ سفر کرتا یہ منظر اسے لاہور واپس لے گیا۔ یونہی دل مچل اٹھا کہ کیوں نہ آج بگھی میں سوار ہو کے سنٹرل پارک کی سیر کر کے لاہور کی یاد تازہ کی جائے۔ لہٰذا وہ ایک بگھی میں سوار پلازا ہوٹل سے ہوتی ہوئی سنٹرل پارک کے بیچ رینگنے لگی، تو اسے فٹ پاتھ پہ پڑے چھابڑے میں نیویارک کی مختلف عمارات کی تصویریں کسی چھابے سے ہالی وڈ کے اداکاروں کی بلیک اینڈ وائٹ پوٹریٹ میں شیشے کے فریموں میں مارلن برانڈو، ہمفرے بوگارڈ، مارلن منرو آڈری ہیپ برن، کسی چھوٹے سے خوانچے پہ کوئی افریقی سیاہ فام مشہور برانڈ کے جعلی پرس اور کہیں پہ جعلی گھڑیاں بیچتا نظر آیا۔ کہیں کوئی فنکار اپنے بنائے ہوئے شاہکار کی پینٹنگز زمین پہ رکھے بیچتا نظر آیا۔ انہی چھابڑوں کے درمیان کچھ مصور سیاحوں کی تصویریں بناتے نظر آئے۔ یونہی ایک فولڈنگ کرسی پہ بہت بڑے ڈرائنگ پیڈ کے پیچھے ایک لمبی سیاہ داڑھی نظر آئی۔

اس کے ذہن میں علی بابا کا ہیولا ابھرا۔ لیکن اس وقت بگھی چھوڑنے کو دل نہ

چاہا۔ جب سنٹرل پارک کا چکر پورا ہو گیا تو پیدل مصوروں کی قطاروں میں تانیہ نے علی بابا کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ لیکن کہیں بھی علی نظر نہیں آیا۔ ناامید ہو کے اپارٹمنٹ واپس آ گئی۔ لیکن علی بابا کو ڈھونڈنے کا تجسس اور بھی بڑھ گیا۔ اگلے روز پھر سنٹرل پارک کے باہر بیٹھے آرٹسٹوں کی قطار میں علی کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ علی بابا بیٹھا ایک فرانسیسی سیاح کا چارکول سے پورٹریٹ بنا رہا تھا۔ تانیہ کے دل بھولے بسرے دنوں کی یادوں نے ایک خوشی کی لہر دوڑا دی۔ دونوں پہلے کی طرح دلچسپ گفتگو میں محو ہو گئے۔ دونوں نے اپنی اپنی مصروفیت کے چارٹ سے ایک دوسرے کو آگاہ کیا۔ جس میں تانیہ کو سب سے زیادہ دلچسپی علی کی زندہ انسان کی ڈرائنگ کی وہ کلاس تھی جس میں ہر کوئی مصوری سے دلچسپی رکھنے والا شمولیت کر سکتا تھا۔ آرٹ کے تعلیم یافتہ ہونے کی کوئی بندش نہ تھی۔ آرٹ سٹوڈنٹ لیگ سنٹرل پارک سے بالکل ہی قریب تھی اور کلاس کا وقت بھی شام کے چھ بجے کا تھا تانیہ نے اپنے کام ختم کر کے اس کلاس میں شمولیت کا ارادہ ظاہر کیا تو علی بابا بخوشی ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اگلے ہی روز شام چھ بجے دونوں آرٹ سٹوڈنٹ لیگ پہنچے۔ ڈرائنگ کا کمرہ طالب علموں سے بھرا ہوا تھا۔ بنچوں کی قطار ایک دائرہ میں لگی ہوئی تھی۔ ہر بنچ پر ایک مصور اپنے ڈرائنگ پیڈ اور پنسل یا چارکول کے ساتھ بیٹھا تھا۔ بنچوں کے وسط میں ایک برہنہ عورت آ کے کھڑی ہو گئی۔ پہلے دو منٹ کا پوز تھا۔ پھر پانچ پانچ منٹ کے بدلتے پوز تھے۔ آخر میں ایک گھنٹے کا لمبا پوز تھا۔ سب مصور بڑے انہماک کے ساتھ اس کے جسم کے نقش اپنے پیڈ پر اتار رہے تھے۔ تانیہ پر پھر اناٹمی کے حساب کتاب کا دورہ پڑا۔ پھر جسم کے اندر دل گردے مثانے، سرخ گاڑھے رنگ کے پانی میں تیرتے نظر آئے۔ اس نے گھن اور اضطراب کی حالت میں بڑی مشکل سے اپنی چیخ کو روکا۔ تمام مصور برہنہ ماڈل کو دیکھ رہے تھے اور ماڈل تانیہ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی اضطرابی حالت بھانپ گئی۔ ڈرائنگ کا سیشن ختم ہوتے ہی ماڈل بھاگ کر ڈریسنگ روم سے جلدی سے کپڑے بدل کر واپس

کلاس میں آ گئی اور تانیہ سے کچھ انگریزی میں گفتگو کی۔ تانیہ نے ماڈل سے پوچھا تم ایسا کام پیسے کے لیے کرتی ہو۔ نہیں ماڈل نے جواب دیا اور کہا کبھی سورج اور سورج مکھی کے پھول کو دیکھا۔ جیسے تانیہ سوچ میں پڑ گئی، تانیہ کے چہرے پہ شگفتگی کے آثار کھلتے ہوئے پھول کی مانند لگنے لگے۔ علی بابا لاکر میں اپنا آرٹ کا سامان رکھنے گیا ہوا تھا۔

اگلے روز حسب معمول علی بابا دن کی مصروفیت سے فارغ ہو کر شام کو چھ بجے اپنی ڈرائنگ کی کلاس میں چلا گیا۔ پورا دن تانیہ سے بات نہ ہو سکی۔ شاید علی کو سمجھ آ گئی تھی اسے برہنہ جسموں سے آرٹ کی تعلیم حاصل کرنا پسند نہیں ہے۔

اس نے اپنا ڈرائنگ پیڈ نکالا۔ سب مصور دائرے میں اپنے اپنے بنچوں پر آ کر بیٹھنا شروع ہو گئے۔ علی نے بھی پیڈ کو کھول کر بنچ کے کونے سے ٹکایا۔ اپنے بستے سے ڈرائنگ کا سامان نکالنا شروع کر دیا۔ چھوٹے سے چمڑے کے بٹوے سے چارکول کی موٹی پنسل نکال کر مضبوطی سے انگلیوں کی گرفت میں لیا۔ ذہن کو تیار کیا آنکھوں سے دیکھے ہوئے شبہ کو کیسے دماغ میں ریکارڈ کر کے اپنے پنسل کا تعلق دماغ سے جوڑے۔ پیڈ کے صفحے کو ڈرائنگ کی مناسبت سے تقسیم کر کے جب برہنہ ماڈل کی شبیہہ کو دماغ کے پیڈ پر منجمد کر کے اُس نے سر اٹھایا تو ایک دم اس کے دماغ میں 200 وولٹ کا بلب جل اٹھا اسے 440 وولٹ کا ایک بجلی کا سا جھٹکا لگا۔ کیونکہ اس کے سامنے تانیہ برہنہ ماڈل بنی کھڑی تھی۔ علی بابا کے جسم کے جار میں ساکت کھڑے ہوئے تیزابوں کو انرجی کا ایک سپارک ملا۔ گردش تیز ہو گئی۔ اس کے ہاتھ کی رگوں نے جسم کی تمام شریانوں کا خون پچکاری کے پمپ کی طرح کھینچ کر دل میں بھر دیا۔ دل نے خون کے بجائے ہزاروں رنگوں کا فوارہ دماغ میں پھینکنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ نے ہاتھ تیزی سے حرکت کرنا شروع کر دی۔ جیسے اس کے دماغ میں کوئی بند بندھا تھا جو ٹوٹ گیا۔ اُس نے کسی کھوئی ہوئی شکل کے خدوخال کاغذ پہ ابھارنا شروع کر دیے۔

تانیہ نے سب مصوروں کو غور سے دیکھا سب کے سب اس کے حسن کے ایک ایک رنگ کو جمالیاتی نظروں میں سمور ہے تھے۔ ان کی نظروں سے حسن کے چھپے ہوئے راز افشا ہونے لگے۔ جیسے وہ سب اس کے حسن کے قصیدے غزل میں کہہ رہے ہوں۔ ان کی نظروں سے نکلے ہوئے لفظ وہ پڑھ سکتی تھی جیسے وہ اس کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک حسن کی تعریف کر رہے ہوں۔ اس کو زندگی میں پہلی دفعہ اپنے حسن کی تعریف کا نشہ نصیب ہوا تھا۔ پہلی دفعہ اسے احساس ہوا جسم کوئی مشین نہیں جو گراریوں اور پرزوں کا مرکب ہو جسم میں روح ہے اس کی پہچان دوسری روح ہی کرتی ہے۔ اس کے دماغ میں ہڈیوں کے جوڑوں کے حساب کتاب کی جگہ جمالیاتی حسن نے لے لی۔ وہ حسن جو دیکھنے والے کی روح میں بستا ہے۔ اسے ایسی تسکین مل رہی تھی جیسے وہ حسن کی ملکہ ہو۔ سورج ہو اور باقی سب سورج مکھی کے پھول ہوں۔ سورج کے حسن کی دھوپ سورج مکھی کے پتوں میں رنگ بھر رہی ہو۔

جیسے ہی ڈرائنگ کا وقت ختم ہوا علی بابا پاگلوں کی طرح ناچنے لگا۔ تانیہ جیسے ہی ڈریسنگ روم سے کپڑے پہن کر واپس لوٹی۔ علی بابا نے اسے خوشی سے گلے لگا لیا۔ خوشی اور جوش کے ملے جلے جذبات سے کانپتے ہاتھوں سے اپنی ڈرائنگ تانیہ کو دکھائی تمہارے حسن کے چکا چوند سپارک نے میرے دماغ میں لگے قفل کو توڑ دیا جو کسی عورت میں شاہکار ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ تمہاری وجہ سے پورا ہو گیا۔

جب تانیہ نے ڈرائنگ پر نظر ڈالی تو حیران رہ گئی۔ وہ خود مدھو بالا لگ رہی تھی۔

☆☆☆

حجر کی آنکھ میں بحرِ اسود

خط نے آہستہ سے کہا۔" سیاہی کے پیڈ سے مہر کو ڈبو کر اور پھر میرے ٹکٹ کے اوپر ہاتھ کو گول گھما کر ثبت کر دو۔ اور ہاں جب تم غصے میں ہوتے ہو تو مہر کو ڈنڈا سمجھ کر مجھے مت پیٹا کرو۔"

"نہیں ایسا تو کبھی بھی میں نے نہیں کیا۔" بختو ڈاکیے نے اپنے ہاتھ کو عین خط کے اوپر لا کر روک کر کہا۔

"ارے تم سے تو میں پیار کرتا ہوں۔ کیونکہ تم لوگوں کو خوشیوں کے سندیسے دیتے ہو۔"... "لیکن میں دکھ کی خبریں بھی تو سناتا ہوں۔" خط نے افسردہ ہو کر کہا۔ لیکن ہم دونوں میں آپس کی باتیں صیغہ راز میں رہتی ہیں۔ ہم اپنی باتیں کسی اور کو نہیں بتاتے۔

لیکن تم تو چرند پرند، جاندار بے جان سب سے باتیں کرتے ہو۔ کیا سب کے راز تمہارے دل میں ہیں۔ اور ہر ایک سے باتیں کر لیتے ہو۔

ہاں خط میاں۔۔۔ بختو نے لفافے کو اٹھا کر دوسرے پارسل کے اوپر رکھ کر کہا۔ مجھے وہ زبان آتی ہے جس میں لفظوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ روح کی زبان ہے۔" روح کی زبان ہے؟" خط نے حیران ہو کر پوچھا۔ تو کیا درختوں، پھولوں، دریاؤں میں روح ہے۔

ہاں ہاں بختو نے کہا بالکل تمہاری طرح۔ ان میں بھی روح ہے۔ اور میں سب سے باتیں کرتا ہوں۔ جیسے میں تم سے گفتگو کرتا ہوں۔ ارے واہ خط نے دلچسپی سے پوچھا۔ بختاور چاچا یہ زبان شروع کب ہوئی تھی۔

"مجھے صحیح تاریخ تو یاد نہیں لیکن اتنا پتا ہے کہ یہ موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے شہر آباد ہونے سے بھی پہلے کی زبان ہے۔ یہ کمبل پوشوں کی زبان ہے۔" "کمبل پوش؟" خط نے پھر سوال پوچھا۔ یہ کمبل پوش کون ہوتے ہیں؟

کمبل پوش جو کمبل اوڑھتے ہیں۔ بختو نے جواب دیا۔ یہ دن میں کمبل اپنے گرد لپیٹ لیتے ہیں اور رات کو وہی کمبل اوڑھ کر سو رہتے ہیں۔

یہ کمبل پوش ہر نبی اور پیغمبر کے پاس اپنی محبت کا پیغام لے کر گئے تھے۔ کوئی بھی انہیں سمجھ نہیں پایا۔ صرف محمد ﷺ کے پاس جب کمبل پوش گئے۔ دونوں نے کوئی بات نہیں کہی کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالا صرف ایک دوسرے کو دیکھا اور صرف دل نے محبت کا پیغام انہیں دیا اور کمبل پوشوں کا گروپ وہاں سے چلا گیا۔

کیا تم بھی کمبل پوش ہو؟ خط نے ایک اور سوال کیا۔

کاش میں کمبل پوش ہو سکتا۔ کوشش تو کرتا ہوں لیکن کہاں میں اور کہاں خدا کے پیارے کمبل پوش۔ لیکن تم اور کمبل پوشوں میں ایک چیز مشترک ہے۔ تم بھی سفر کرتے ہو اور کمبل پوش بھی سفر کرتے رہتے تھے اور محبت کا پیغام دل سے دیتے پھرتے۔ خط نے پھر بختاور سے سوال پوچھا۔ تم بالکل سفر نہیں کرتے۔ بختاور نے جواب دیا۔ ہاں میرے دل کی ایک مراد ہے کہ میں بھی اپنی زندگی کا سب سے اہم سفر کروں۔ پیارے رسولؐ کا حکم مانوں خدا کے گھر کا طواف کروں۔ حضورؐ کے روزے کی جالی کو آنکھوں سے چوموں۔

خط پھر حیران ہوا۔ حضور کے تو اور بھی بہت سے حکم ہیں مثلاً نماز پڑھنا۔ وہ تو تم پڑھتے نہیں ہو۔

دیکھو خط میاں بختو نے تمام خطوں اور پارسلوں کو اپنے تھیلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ صبح جب تم ساروں کو ایک ایک کر کے اکٹھا کرتا ہوں تو میری فجر ہوتی ہے۔ ظہر اور عصر تم سب کو علیحدہ علیحدہ کر کے ان پر مہریں لگا دیتا ہوں۔ اور جب سب خط ان کے گھروں تک پہنچا دیتا ہوں تو میری مغرب کی نماز پوری ہو جاتی ہے۔ عشا کی نماز تو بس زمین اور آسمان کو اپنے دکھ سناتا ہے۔

بختو ڈاکیہ ڈاک خانے سے نکل کر ابھی گلی میں مڑ ہی رہا تھا کہ حمیداں مائی اپنے گھر کے باہر ہی مل گئی۔ بختو چاچا کوئی میرا خط آیا ہے۔ بختو نے فوراً خط نکال کر حمیداں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ہاں یہ لو تمہارا خط۔

بتاؤ تو کس کا ہے اور کیا لکھا ہے۔ یہ تو پتہ نہیں کیا لکھا ہے۔ لیکن یہ ہے تمہارے بیٹے کا خط۔ نکڑ پر بھیجنے والے کا پتا پڑھتے ہوئے بختو نے خط حمیداں کو بڑھا دیا۔

بختو چاچا یہ کیا کہہ رہے ہو تمہیں پتا نہیں کیا لکھا ہے؟ تم تو سب خطوں سے باتیں کرتے ہو۔

ہاں ان سے باتیں ضرور کرتا ہوں لیکن تمہارے بارے میں تھوڑا ہی پوچھتا ہوں۔ اور یہ بھی نہیں پوچھتا کہ پیغام کیا لائے ہو۔

اچھا چلو خط پڑھ کے سناؤ۔ حمیداں نے خط واپس بختو کو دیتے ہوئے کہا۔ اور ہاں لسی روٹی کھا کے جانا۔ نہیں حمیداں بہن بہت کام ہے۔ خط کھولتے ہوئے کہا۔ خط پڑھ کے سنا دیتا ہوں۔

ابھی بختو نے خط ختم کیا ہی تھا کہ حمیداں نے پوچھا حج پہ کب جا رہے ہو؟ بس تھوڑے سے پیسے اور جمع کرنے ہیں۔ چھ مہینے تو لگ ہی جائیں گے پیسے پورے کرنے میں۔ بختو اگلے گھر روانہ ہونے لگا تو حمیداں نے زوردار آواز سے یاددہانی کرائی۔ میرے لیے زم زم کا پانی لانا نہ بھولنا۔

بختو ڈاکیہ اگلے گھر پہنچا۔ وہاں بھی کوئی خط نہیں آیا۔ لیکن بختو ڈاکیہ ہر روز فتح محمد

اور اس کی بیٹی سکینہ کا حال ضرور پوچھنے جاتا۔ فتح محمد جب سے مزدوری کرتے چھت سے گرا تھا کام کے قابل نہیں رہا تھا۔ بس سکینہ اڑوس پڑوس کے کام کاج اور کپڑے سی کر اپنا اور معذور باپ کا پیٹ پالتی تھی۔

جیسے ہی بختو ڈاکیہ دروازے کے اندر داخل ہوا تو دروازے نے شکایت کی۔ آج پورے بیس منٹ دیر سے کیوں آئے ہو؟ بس حمیداں کا خط پڑھنے میں دیر ہو گئی۔ جیسے ہی گھر کے اندر برآمدے میں پہنچا تو سکینہ بھاگی بھاگی لسی کا گلاس لے کے پہنچی۔ تو بختو ڈاکیے نے بڑے پیار سے سکینہ کو دیکھا پیچھے کھڑے ہوئے شریں کے درخت نے اپنی خشک پھلیوں کو چھنکایا جیسے گھنگھروؤں کی چھنکار میں اس نے کہا ہو۔

چہرے سونیں تے خال خد بن دے خوش خط صویں حرف کتاب جی

جیہڑے ویکھنے دے رنجھ وان آرہے

وڈا وعدہ جنہاں دے باپ دا جی

چلو لیلۃ القدر دی کرو زیارت

وارث شاہ ایہہ کم ثواب دا جی

سکینہ نے لسی کا گلاس بختو ڈاکیہ کو تھما دیا۔ دونوں پلک جھپکے بغیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے بہت باتیں کیں۔ لیکن ہونٹوں سے کوئی لفظ نہ نکلے۔ سکینہ کی آنکھوں کے سیپ نے چھوٹے چھوٹے دکھ کے موتی چھلکائے۔

بختو ڈاکیہ افسردہ ہو کے واپس جانے لگا۔ تو فتح محمد نے روک لیا۔ بختاور لسی تو پیتے جاؤ۔ تم نے تو سن لیا ہوگا کہ لڑکے والوں نے رشتہ توڑنے کی دھمکی دے دی ہے۔ سکینہ کا گھر بسانے کے لیے پانچ لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔ لڑکے کو ایئر کنڈیشن کا کورس کرنا ہے۔ اور دبئی جانے کے لیے پیسے چاہئیں۔ چوہدری حشمت اپنی بیٹی کو جہیز کے ساتھ بہت بڑی رقم

دینے کو تیار ہے تو لڑکے والے چوہدریوں کے خاندان سے رشتے کی بات چلا رہے ہیں۔ بختو ڈاکیے نے فتح محمد کو تسلی دی اور کل آنے کا وعدہ کر کے نکلنے سے پہلے سکینہ کو پیار سے دیکھا دونوں کی روحوں نے پیار کی گفتگو بغیر لب ہلائے کی۔

دوسرے دن بختو نے اپنی ساری جمع پونجی جو حج کے لیے جوڑی تھی پوٹلی میں باندھی اور دوپہر کو فتح محمد کے گھر پہنچا۔ سکینہ پھر بھاگی بھاگی لسی کا گلاس لے کے آئی۔ بختو ڈاکیے نے ساری رقم سکینہ کے دوپٹے کے پلو میں باندھ دی۔

پیچھے کھڑے ہوئے شریں کے درخت نے پھلیوں کو چھنکارتے ہوئے کہا۔

شرع چاو سر پوش بنایا جے
رواداروں وڈے گنہگار دے ہو
وارث شاہ مسافراں آنیاں نو
چلو چلی ہی لے پکار دے ہو

بختو ڈاکیے نے شریں کے درخت کی طرف دیکھا۔ شریں چھن چھن کرتے اپنی زبان میں بولا۔ حج کا ٹکٹ پیسوں سے خرید تو سکتے ہو اسے نبھانے کے لیے ہمت چاہیے۔ منزل دور بھی ہے اور مشکل بھی ہے۔ اسی اثنا میں فتح محمد لنگڑاتا ہوا وہاں پہنچا۔ سکینہ نے مجھے پیسوں کے بارے میں بتایا ہے انہیں واپس لے لو، بات پیسوں سے آگے نکل گئی ہے۔

کیا مطلب؟ بختو ڈاکیے نے حیران ہو کر پوچھا۔

بختی میں غریب مزدور گھر میں مہمانوں کو بٹھانے کے لیے چارپائی نہیں ہے۔ اور لڑکے والے چوہدریوں سے رشتہ جوڑتے ہیں۔ ہم تو بس کمی کمین۔ تم فکر نہ کرو اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔

اگلے دن بختو ڈاکیے نے لڑکے والوں کے گھر جانے کی تیاری پکڑی۔ نہا دھو کر جب سفید شلوار قمیض پہننے لگے تو کپڑے بولے احرام حج تمہیں قبول ہو۔ ہمیں فخر ہے کہ تجھ

جیسے نیک انسان کے فریضہ میں ہم کام آئے۔

وہ لڑکے والوں کے گھر پہنچا، دروازہ کھٹکھٹایا تو کوئی باہر نہیں آیا۔ پتا نہیں کیا وجہ تھی۔ دوسرے دن وہ پھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا کسی نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ بختو نے ہمت نہیں ہاری اور دروازے سے پوچھا کیا میری محبت اور کوشش میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ دروازے نے کہا۔ نہیں سات چکر لگاؤ۔ اس میں خدا کی رضا ہے۔ ساتویں مرتبہ گھر سے ایک بچہ نکلا۔ اور دونوں نے روح کی زبان میں باتیں کیں۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔ تیرے اس نیک فرض کو پورا کرنے کے لیے میں حاضر ہوں۔

بچے نے اپنے گھر میں ایک شور برپا کر دیا۔ دیکھو تمہارے دروازے پہ ایک شخص روز آتا ہے اور تم اس کی بات سنتے کیوں نہیں۔ بچے کو یوں لگا کہ جیسے اس کے گھر والوں کو شیطان ورغلا رہا ہے۔ اپنا غصہ نکالنے کے لیے اس نے اپنے گھر کنکریاں ماریں۔ اسے یوں لگا کہ اس نے شیطان کو وہاں سے بھگا دیا ہے۔ اور لڑکے والوں کے دل میں تھوڑا رحم پیدا ہوا اور وہ راضی ہو گئے۔ بختو ذاکیے سے بات کرنے پر طے پایا کہ سب کچھ بھری پنچایت میں باہر میدان میں اس کا فیصلہ کریں گے۔ ساری پنچایت اس میدان میں اکٹھی ہوئی۔ جیسے ہی بختو اس میدان میں بیٹھا تو میدان کی روح نے بختو ذاکیہ کو دعا دی کہ تم نے مجھے میدان عرفات کا رتبہ بخش دیا۔ درختوں کی چھاؤں اور بھی گھنی ہو گئی۔ بادلوں نے گرمی کی حدت اور بھی کم کر دی۔ برابر میں لگا ٹیوب ویل کے نل سے نکلتا ہوا شفاف اور ٹھنڈا پانی چھوٹی چھوٹی کھالیوں سے گزرتا ہوا تازگی بکھیر رہا تھا۔ کچے کوٹھے میں لگا ہوا ٹیوب ویل کے انجن کا بڑا لوہے کا پہیہ جب بھی اپنا چکر پورا کرتا تو کونے سے باہر نکلا ہوا پائپ دھوئیں کو دھکے کے ساتھ پھک پھک کی آواز کے ساتھ حق حق کا ورد کرتا۔ درختوں کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی فاختیاں اللہ ہو اللہ ہو کا ورد کرتیں۔ ٹیوب ویل کے پاس بیٹھا ایک گڈریا اپنی بھیڑوں کو کھلا چھوڑ کے اونگھ رہا تھا۔ بختو ذاکیہ میں اور پنچایت میں بہت بحث جاری تھی۔

بختو ڈاکیہ ہر حالت میں سکینہ کا رشتہ جوڑنے میں کوشاں تھا۔ لیکن لڑکے والوں کی آنکھوں پر جھوٹی شان اور دولت کی پٹی بندھی تھی۔ وہ رشتہ جوڑنے کے حق میں نہیں تھے۔ بچے کو بہت غصہ آ رہا تھا۔ کیوں نہیں میرے گھر والے مان رہے۔ اس نے پیار سے بختو ڈاکیے کو دیکھا اور روح کی زبان میں یہ پیغام دیا کہ میں اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔ میری جان کی قربانی شاید میرے گھر والوں کو کوئی سبق سکھا سکے۔ اور وہ بھاگ کر ٹیوب ویل والے کمرے میں گھس گیا۔ اسی وقت گڈریے کی ایک بھیڑ بھٹکتی ہوئی لڑکے کے پیچھے ٹیوب ویل والے کمرے میں جا پہنچی۔ لڑکے نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے کو ٹیوب ویل کا پٹا جو پہیے کو گھماتا ہے، میں پھینک دے گا۔ وہ اپنی آنکھیں بند کیے اپنے آپ کو پھینکنے ہی لگا تھا کہ اک دم جیسے ساری کائنات رک گئی۔ ٹیوب ویل کی حق حق کی آواز بند ہو گئی۔ فاختاؤں نے اللہ ہو کرنا بند کر دیا۔ پنچایت سمجھی کہ بچے نے جان دے دی ہے۔ اسی اثنا میں بختو ڈاکیے نے لڑکے والوں سے یہ وعدہ لے لیا کہ دیکھو خدا کے حکم کو مت بدلو۔ میں خدا سے تمہارے بچے کی جان کی بھیک لے لوں گا۔ اگر تم میری بیٹی سکینہ کی زندگی کے سکھ دے دو۔ لڑکے کے گھر والے اپنے بچے کی زندگی کے صدقے مان گئے۔ اور لڑکا بالکل ٹیوب ویل کے پٹے میں اپنے جسم کو پھنسانے ہی والا تھا کہ عین وقت پر بھیڑ کا پاؤں پھسلا اور وہ پٹے میں پھنس گئی۔ ٹیوب ویل رک گیا پورا کمرہ خون کے چھینٹوں سے سرخ ہو گیا اور بچہ خوف سے بے ہوش ہو گیا۔

ٹیوب ویل کے مستری نے انجن بند کیا۔ بچے کو کچھ نہیں ہوا تھا بس پاؤں پر ہلکی سی خراش تھی۔

سب وہاں پہنچے تو بچے کو زندہ دیکھ کر خوش ہو گئے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ شاید خدا کا یہ اشارہ ہے کہ اس رشتے میں خدا کی مرضی شامل ہے۔ دو دلوں کے رشتے کا ملاپ خدا کی محبت کی نشاندہی ہے۔ لڑکے والے بختو ڈاکیہ کو گلے مل رہے تھے اور اس کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ تم نے ہمیں سیدھا رستہ دکھا دیا ہے۔ وہ راستہ جس میں ساری کائنات مدد کرتی ہے۔

ٹیوب ویل کے مستری نے پھر ٹیوب ویل چلایا۔ پھر وہی حق حق کی آواز آئی۔ اس دفعہ

ٹیوب ویل کا پانی اور بھی شفاف اور میٹھا لگ رہا تھا۔ بختو ڈاکیہ نے مستری سے ایک خالی بوتل لے کے اس میں ٹیوب ویل کا پانی بھر لیا اور بوتل نے بختو ڈاکیہ سے کہا اچھا تو یہ آبِ زم زم حمیداں کے لیے لے جا رہے ہو۔

سب گلے مل رہے تھے اور بختو ڈاکیے کو مبارکباد دے رہے تھے۔ بختو بہت خوش تھا۔

سب سے پہلے فتح محمد کے گھر گیا تو دروازے نے پھر شکایت کی آج پھر دیر سے آئے۔ چلو کوئی نہیں حج کے فریضہ میں دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔ حسبِ معمول سکینہ لسی کا گلاس لے آئی۔ بختو ڈاکیہ نے سکینہ کا محبت سے ماتھا چوما لفظوں کے بغیر زبان سے کہا جا ڈا اپنا منہ دھولو۔ مٹی سے تیرا رنگ کالا ہوا ہے۔

پاس کھڑے ہوئے شریں کے درخت نے پھر اپنی پھلیوں کو چھنکایا گھنگھروں کی چھن چھن میں کہا۔ یہ حجرِ اسود بھی تو کالا ہے۔ پھر زور سے چھن چھن کی۔

دونویں راہ مجاز دے رہے
ثابت صدق دے گئے وہ میاں
وارث شاہ اس خواب سرا ہے
وانہ دی تنی وا جڑے گئے وجامیاں

سکینہ کی شادی بڑے سادہ طریقے سے ہوئی۔ دونوں میاں بیوی دبئی چلے گئے۔ چار سال بعد سکینہ اپنے خاوند کے ساتھ واپس آئی۔ بختو ڈاکیہ سکینہ کو ملنے اس کے گھر پہنچا۔ تو سکینہ نے اپنے دوپٹے سے بختو چاچا کے پیسوں کی پوٹلی کھولی۔ اور صرف آنکھوں سے بولی۔ آپ یہ پیسے لے کے حج پہ چلے جائیں۔

بختو ڈاکیہ نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ میرا حج تو چار سال پہلے قبول ہو گیا تھا۔

شریں کے درخت نے پھر اپنی پھلیاں کھڑکائیں۔

حاجی بختاور پیسے لے او عمرہ بھی تو کرنا ہے۔ مائی حمیداں کی بیٹی بھی تو جوان ہو گئی ہے۔

☆☆☆

موت کی زندگی

چھوٹے سے شہر کی چھوٹی سی لائبریری میں مختلف مضامین کے مختلف سیکشن بنے تھے۔ کہیں سے بھی فلسفے کی کتابوں کی قطار شروع ہوتی نہ جانے کہاں ختم ہو کے تاریخ کی کتابوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا لیکن لائبریری کے انچارج کو سب سیکشن زبانی یاد تھے۔ ویسے بھی شہر کے لوگوں کو لائبریری میں آنے اور کتابیں نکلوانے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اکا دُکا طالب علم سالانہ امتحانات کی تیاری کیلئے لائبریری کی میز کرسیوں کا استعمال، قبل از فرنگی دور کے بڑے پروں والے پنکھوں کی ہوا میں بیٹھ کر کر لیتے جن کے چلنے کی آواز متواتر یہ احساس دلاتی کہ بنی نوع انسان یہاں موجود ہے۔ لائبریری کا چپڑاسی پنکھے کی مدھر راگنی میں اونگھتا رہتا۔ اس کو متوجہ کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ پنکھے کو بند کر دو۔ یوں لگتا کہ لائبریری کا نظام شمسی ساکت ہو گیا ہے۔ فوراً ہڑبڑا کے اس کے منہ سے یہ نکلتا ''صاب چائے لاؤں۔''

''ہاں چائے لے آؤ۔'' علامہ اقبالؒ کے پورٹریٹ کے سامنے بڑا وال کلاک ہر روز بارہ بجے دونوں ہاتھ جوڑ کے التجا کرتا میرا پورٹریٹ بھی سال میں ایک دفعہ دھو دیا کرو۔

نفسیات کی کتابوں والے شیلف کے نیچے ایک مکڑے کی اپنی راجدھانی تھی۔ اسے کبھی بھی کوئی تنگ نہ کرتا۔ وہ بس اپنے منہ سے شیلف اور دیوار کے درمیان جالے اگلتا رہتا، انہی جالوں میں اپنا بسیرا کرتا، انہی کو پل بنا کر دیوار سے شیلف اور شیلف میں رکھی کتابوں پر مارننگ اور ایوننگ واک کرتا اور جب ایک جگہ سے تنگ آ جاتا تو دوسری جگہ خود ہی پہنچ جاتا اور اسے وہاں سے بھگانے کی کوئی کوشش نہ کرتا۔

....

چھوٹے سے شہر کے چھوٹے سے محلے میں ایک بڑھئی رہتا تھا۔ اس محلے میں گھروں کے باہر ناموں کی تختیاں نہیں ہوتی تھیں۔ سب لوگ ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے۔ ایک ڈسپنسری تھی اور حاجی ڈسپنسر سے سب کا واسطہ رہتا تھا۔ جب بھی کسی کو کھانسی، نزلہ یا زکام کی شکایت ہوتی تو وہ خود ساختہ مکسچر پلا کر نمک کے غرارے اپنے سامنے کروا دیتے۔ ان کے ہاتھ میں بہت شفا تھی۔ سنتے تھے کبھی کبھی ڈاکٹر صاحبان بھی ان سے دائمی نزلہ کے علاج کیلئے وہی مکسچر لینے آتے تھے۔ ان کی ڈسپنسری پر کوئی بورڈ نہیں تھا۔ بس ڈسپنسری ان کے گھر کے اندر ہی تھی، یعنی جب سے وہ ہسپتال سے ریٹائر ہوئے تھے، انہوں نے اپنے گھر کی بیٹھک کو جس کا دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا، ڈسپنسری میں منتقل کر دیا تھا لیکن گھر کے مین دروازے کے اوپر "ہذا من فضل ربی" کا بورڈ ضرور لگا تھا۔ یہی اکلوتا بورڈ محلے میں تھا۔ ڈسپنسری گلی کے نکڑ میں تھی اور ساتھ والی گلی کا آخری گھر بڑھئی کا تھا۔ اس کے بعد گلی بند ہو جاتی تھی۔ اس بند گلی کو وہاں کے رہنے والے اپنے استعمال کیلئے پرائیویٹ پراپرٹی کے طور پر استعمال کرتے تھے، یعنی حاجی صاحب ڈسپنسر کی بھینس بھی وہیں بندھتی تھی اور بھینس کے ساتھ JG-29 بھی وہیں کھڑی ہوتی تھی۔ JG-29 ٹویوٹا کرولا کی نمبر پلیٹ نہیں تھی۔ یہ حاجی صاحب کی گدھی کے بائیں کولہے پہ لوہے سے جلے ہوئے نمبر کا نشان تھا جو محکمہ حیوانات کے ریکارڈ کیلئے جانور شماری کے کام آتا۔ اس گدھی کو حاجی صاحب بھینس کا

چارہ لانے کیلئے استعمال کرتے تھے۔ چارہ ڈھونے کے علاوہ وہ بند گلی کی حفاظت بھی کرتی تھی، یعنی اگر کوئی بھولا بھٹکا اس گلی میں آ نکلتا تو یہ گدھی اپنی دولتی سے اسے وہاں سے بھگا دیتی۔ جب بھی کسی کو دولتی پڑتی تو محلے کے لڑکے شور مچا دیتے کہ آج JG-29 کا نائی راؤ کھل گیا ہے۔ یہ بڑھئی روئی دھنکنے کی مشینوں کو درست کرتا تھا اور محلے کے لڑکوں کو رنگ برنگے لٹو بھی اپنی خراد پر گھڑ کے دیتا تھا۔ سب لڑکے اس کی بڑی عزت کرتے تھے، اس بڑھئی کا ایک بیٹا تھا، وہ لڑکوں کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے اپنا نام بھی پسند نہیں تھا۔ دراصل بڑھئی کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ بڑی منتوں کے بعد عمر کے آخری حصے میں ان کا بیٹا ہوا جو حضرت پیر دیجی شاہ کے مزار پر اس منت کے ساتھ بڑھئی نے وعدہ کیا "اے پیر کامل مجھے اپنی کرامات کے صدقے اللہ کے حضور سے ایک بیٹا بخش دے تو میں اس کا نام اللہ بخش رکھوں گا"، لیکن اللہ بخش نے جب سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو اسے ایسے نام اچھے نہیں لگے مثلاً اللہ دتہ خدا بخش، اللہ بخش وغیرہ وغیرہ، لیکن والدین کی پیر دیجی شاہ سے عقیدت اور وعدے کی وجہ سے اسے اپنا نام برداشت کرنا پڑا۔

....

لائبریری میں چونکہ لوگوں کی آمدورفت کچھ زیادہ نہیں تھی اس لیے کیڑے کی عادات کچھ بگڑ سی گئیں اسی لیے وہ بڑی دیدہ دلیری سے گھومتا پھرتا۔ چمڑے کی خوشبو سونگھنے کو دل چاہتا تو چمڑا اسی اور لائبریرین کے جوتوں سے اپنے دماغ کو تر و تازہ کرتا، کپاس اور اون سے بنے ہوئے کپڑوں کو چکھ کر اپنے منہ کا ذائقہ تبدیل کر لیتا۔ جب بھی کبھی رومانٹک موڈ ہوتا تو باہر نکل کر کسی جوہڑ میں کھڑے پانی میں' موسم بے عاشقانہ' کے مزے تیر کر اور ڈبکیاں لگا کر لیتا۔

ایک دن اسی طرح بے خیالی میں انگریزی ادب کے شیلف سے گزرتا ہوا وہ لائبریری کے فرش پر گھوم رہا تھا کہ اسے ایک حادثہ پیش آ گیا۔ لائبریرین جو کبھی اپنی کرسی سے

نہیں ہلتا تھا، To Be, Not To Be کرتا ہوا انگریزی کے شیلف کے قریب پہنچا تو کیڑے کی ایک ٹانگ اس کی اونچی ایڑھی والی چپل کے نیچے آ کے کچلی گئی۔ فوراً کیڑا وہاں سے تیزی سے بھاگا۔ اس کی آٹھ ٹانگوں میں ایک کم بھی ہو جاتی تو اس کی ساتوں ٹانگیں جسم کا ہلکا بوجھ آسانی سے سہار لیتیں اور رفتار میں کوئی کمی نہیں آنے دیتیں لیکن وہ اتنا ڈر گیا کہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ میں سوچ سمجھ کر یا بالکل ہی باہر نہیں جاؤں گا۔

....

اللہ بخش ہمیشہ اپنے آپ کو محلے کے لوگوں سے دور رکھتا۔ اسے احساسِ کمتری تھا یا احساسِ برتری، میرا مطالعہ انسانی نفسیات پر اتنا نہیں کہ میں اس کا کوئی تجزیہ کر سکوں۔ ہوسکتا ہے کہ اسے اپنا ناپسند نام پریشان کرتا ہو کیونکہ اس طرح کے نام دیہاتی لوگ رکھتے تھے۔ ویسے بھی اس کا سٹائل اپنے ہم عمر لڑکوں سے مختلف تھا۔ اکلوتا ہونے کا بھی اسے بڑا فائدہ تھا۔ بیل باٹم پتلون کی کریز کبھی بگڑنے نہ دیتا۔ لمبی لمبی قلمیں گردن کو چھپاتے ہوئے لمبے بال ہر پانچ منٹ کے بعد اپنی فائل کے اندر لگے ہوئے چھوٹے شیشے کو دیکھ کر اندرونی فلیپ میں لگی کنگھی سے درست کرتا رہتا۔ نئے ماڈل کا بیکو سائیکل پر لگا ڈائنمو اسے دن رات روشن رکھتا اور ہارن کی پی پی بجاتا رہتا لیکن نام بتاتے ہوئے ہمیشہ جھجکتا۔ کسی نے مشورہ دیا میونسپل کمیٹی سے اپنی پیدائش کے سرٹیفکیٹ پر نام دو گواہوں کی گواہی سے تبدیل کروا لو لیکن مشکل میٹرک کے سرٹیفکیٹ کی تھی۔ اس پر تبدیلی کیلئے خاصے جتن کرنے پڑتے تھے۔ وہ انہی کوششوں میں تھا کہ ایک دن ایسا بخار چڑھا کہ وہ بستر سے اٹھ نہ سکا۔ ولایتی ڈاکٹروں سے بھی علاج کروایا۔ ٹائیفائیڈ اور نہ جانے کیا کیا فائیڈ والی انگریزی بیماریوں کے امتزاج سے اس کی بائیں ٹانگ ناکارہ ہو گئی۔ اللہ بخش کے والدین کو پورا یقین تھا یہ دیجی شاہ کی بددعا ہے۔ اس حادثے نے اسے اور بھی چڑچڑا کر دیا لیکن ایک واقعہ نے اس کی شخصیت کو نیا رخ دیا۔

ایک دن وہ اپنے کسی رشتہ دار کی شادی میں شمولیت کے لیے کسی دوسرے شہر گیا۔ وہاں اللہ بخش کی دور پار کے رشتہ دار کی فیملی سے ملاقات ہوئی۔ ان سے وہ بہت متاثر ہوا۔ عبدالباقر صاحب خود تو چھوٹے سے شہر کے ایڈیشنل جج تھے لیکن تھے اللہ بخش کے محلے سے۔ ان کی بیگم کراچی سے تھیں۔ عبدالباقر صاحب اور ان کی بیگم اپنے بچوں سے انگریزی میں باتیں کرتی تھیں۔ اللہ بخش ان سے بہت متاثر ہوا کہ فیملی کتنی تعلیم یافتہ ہے۔ ان کا بچہ بچہ انگریزی میں گفتگو کرتا ہے۔ ان کی نقل میں چھری کانٹے سے کھانے کی کوشش میں بھوکا رہ گیا لیکن اسے باقر صاحب کی صحبت نے بھوک کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ وہ بھی اپنی گفتگو میں انگریزی زبان کا خاصا استعمال کرتے تھے۔ اردو میں بولنے کے بعد اس کا انگریزی میں ترجمہ زوردار لہجے سے کرتے: ''مجھے پتا نہیں ہے، I don't know'' ''بیشک، Ofcourse'' اور اردو بھی بڑے انگریزی انداز سے بولتے تھے۔ موسیقی پر بات چل نکلی تو مغربی موسیقی کے گلوکاروں اور موسیقاروں کے بیسیوں نام گنوا ڈالے۔ ہمت کر کے جب پاکستانی گانوں کا پوچھا گیا تو بڑے انگریزی انداز میں اردو بولتے ہوئے اس گانے کی بہت تعریف کی: ''تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے'' گانے کی پسند کی بڑی وجہ گلوکار کا نام تھا'' ایس بی جان اور موسیقاروں میں ایس ڈی برمن۔ بس اس دن سے اللہ بخش نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنا نام اے بی کہلوائے گا لیکن آخر میں پڑھا لکھا ظاہر کرنے کے لیے یہ طے کیا کہ اے بی حسرت اچھا رہے گا۔

گھر آ کر جتنے بھی انگریزی کے مضمون میٹرک سے پہلے پڑھے تھے، ان کا رٹا لگانا شروع کر دیا۔ Postman، Thirsty Crow...... ان مضامین کی انگریزی کو اپنی گفتگو میں استعمال کرتا۔ کوئی گلی میں ملتا تو Morning Walk کا سارا مضمون پڑھ دیتا۔ let's go far a walk یا post man is my best friend سنا دیتا۔

مکڑا ہمیشہ اکیلا بیٹھ بیٹھ کے بڑے سے بڑے جالوں کی تعداد بڑھانے لگا۔ ایک جگہ بیٹھے رہنے سے تنہائی کا احساس بڑھنے لگا۔ اس نے زندگی کو رنگین بنانے کا ایک اور طریقہ نکالا۔ وہ اپنے منہ سے ایک باریک تار نکال کر اس کی مدد سے نیچے آ جاتا۔ پھر اسی تار کو نگل کر واپس اپنے جالے میں چلا جاتا۔ ایک دن اس نے جسم کے رونگٹوں میں سرسراہٹ سی محسوس کی۔ اپنے حواس خمسہ یا جتنے بھی حواس تھے، کو بروئے کار لاتے ہوئے پتا چلایا کہ یہ کون جو جگ جگ جی کے ہماری نگریا میں آیا ہے۔ اپنے منہ کی چرخی پر لپٹی ہوئی ڈور کی مدد سے پتنگ گڈے کی طرح مستی میں جھومتا ہوا نیچے اترا تو بس اس کی کیفیت "جھوم جھوم کے ناچو آج گاؤ خوشی کے گیت ہو" کی طرح تھی۔ کیا دیکھا، ایک خوبصورت مکڑی تیزی سے بھاگتی اور پھر کھڑی ہو جاتی۔ مٹیالے رنگ کے جسم پہ سنہرے بال، بالکل کسی امریکن بلانڈ کی طرح تھی۔ شاید سکندر اعظم کے ساتھ کوئی مکڑا یا مکڑی میسوڈونیا سے یہاں آ کر بس گیا ہوگا۔ دونوں نے انگریزی کے سیکشن میں رومیو جولیٹ کی کتاب "سائے میں (Dates) ملاقاتوں" کا سلسلہ شروع کیا۔

....

اے بی حسرت کی انگریزی میں گفتگو کی دھوم پورے محلے میں پڑ گئی۔ گلی میں اونچی آواز سے بتانے کی کوشش کرتا کہ محمد حسین کتاب گھر سے تازہ پاکستان ٹائمز لینے جا رہا ہوں۔ گلی کا سنیارا جسے انگریزی فلموں کا بہت شوق تھا، انگریزی کی پریکٹس کرنے کے لیے The Guns of Nevoran، Fall of the Roman Empire جیسی فلموں کے ٹائٹل پڑھ کر محلے والوں کو بتانے کی کوشش کرتا ہم وہی ہیں جو بہت پڑھے لکھے ہیں۔ گلی کے بچے بھی ان سے انگریزی کے الفاظ کے معنی پوچھنے آتے۔

اسی محلے میں ایک گلی پتھروں والی کہلاتی تھی۔ پورے شہر کی واحد گلی تھی جو پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ پتھروں والی گلی میں ایک بہت بڑا حویلی نما مکان تھا جس کا بڑا مین گیٹ

ٹین کا بنا ہوا تھا۔ اس میں خدا آپ کا بھلا کرے بیس سے پچیس کنبے رہتے تھے۔ نچلے حصہ کو نیچے بندوں کا نال کہا جاتا تھا۔ وہاں سب کے سب حقے بنانے کا کام کرتے تھے اور بانس کی چھوٹی چھوٹی نالیوں کو اسٹوو کی آگ پر موڑ کر اس پر کپڑوں کی تاکیاں لپیٹ کر ان پر سلور، تانبے اور لوہے کی تاروں کو لپیٹ دیتے۔ انہیں مٹی یا صراحی نما برتن میں فٹ کر دیتے۔ حقے بنانے والا یہ کنبہ پورے ملک میں مشہور تھا۔ یہاں سے حقے بن کر پورے ملک میں جاتے۔ یہ خاندان آپس میں بہت جڑا ہوا تھا اور پورے محلے سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ ان کی اپنی رسمیں ہوتی تھیں۔ اسی کنبے میں ایک لڑکی تھی جس کا نام بھوری تھا۔ بھوری بہت خوبصورت تھی، بس اپنے حسن میں وہ زیب النسا تھی۔ قصہ مختصر بھوری بہت خوبصورت تھی اور وہ نادیں جماعت کی گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کی طالبہ تھی۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر اس چھتروں والی گلی سے نکل کر کسی اچھے خاندان میں بیاہی جائے۔ بھوری کی ماں نے اے بی حسرت سے اپنی بیٹی کو انگریزی پڑھانے کو کہا تو وہ فوراً رضا مند ہو گیا اور ہر روز شام چھ بجے انگریزی پڑھانے آجاتا۔

....

مکڑی ہر روز رومیو جولیٹ کتاب کے پیچھے مکڑے سے ملنے آجاتی۔ دوستی حد سے بڑھنے لگی تو تکلف کا ذوق شرافت کی حدوں کو پار کرنے لگا۔ ایک دن گھنگھور گھٹا لہرائی بادل گرجے تو مکڑے نے اپنا مدعا بیان کر دیا تو مکڑی نے اسے یاد دلایا تمہیں تو پتا ہے ہماری نسل کی یہ ریت ہے کہ مکڑی کو حاصل کرنے کے لیے مکڑے کو مکڑی کے ساتھ کشتی لڑنی پڑتی ہے۔ جب مکڑی مکڑے کو کشتی میں پچھاڑ دے اور وہ کشتی ہار جائے تو تمہیں پتا ہے اس کا انجام۔ مکڑے نے کہا ہاں ہاں مجھے پتا ہے، مکڑے کو ہار کی صورت میں موت قبول کرنی پڑتی ہے۔ دیکھو اگر تمہارے ہونٹوں کا رس پینے کی قیمت موت ہے تو مجھے قبول ہے، یہ کہہ کر اس نے چیلنج قبول کر لیا۔

دونوں کے درمیان دنگل شروع ہوگیا۔ مکڑے کو بہت گمان تھا کہ وہ مکڑی کو آسانی سے ہرا لے گا لیکن جب سنہرے رونگٹوں والی مکڑی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے تو مکڑے کو احساس ہوا کہ مکڑی بہت طاقتور ہے اور ایک ٹانگ کی کمی کی وجہ سے اس کا کوئی داؤ پیچ نہ چل سکا اور مکڑا کشتی ہار گیا۔

....

بھوری اور اے بی حسرت دونوں ہر شام ملنے لگے۔ گو اے بی حسرت بھوری کو اس کی ماں کے سامنے پڑھاتا لیکن دونوں میں محبت کا رشتہ بڑھتے بڑھتے جنوں کی حدوں کو تجاوز کرنے لگا۔ یوں لگتا تھا دونوں ایک دوسرے کے بنا جی نہیں سکیں گے۔ ملاقاتوں کا سلسلہ نیچے بندوں کے تال سے مختلف جگہوں پر ہونے لگا اور طے پایا دونوں اپنے اپنے والدین سے رشتے کی بات چلائیں گے لیکن بھوری کو پتا تھا کہ اس کے خاندان والے بہت سخت ہیں۔ باہر رشتہ دینے میں راضی نہیں ہوں گے۔ دونوں نے قسمیں کھالیں کہ ہم ایک دوسرے کے نہ ہوسکے تو ہم مل کر زہر کھالیں گے۔ اے بی حسرت نے بھوری کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی اگر میں تجھے نہ پاسکا تو اپنے آپ کو اس زندگی سے جدا کرلوں گا۔ بھوری بھی اسے دل سے چاہتی تھی۔ وہ بالکل چپ رہی کوئی قسم نہیں کھائی، صرف سر ہلا کر حامی بھر لی۔

دونوں نے اپنے والدین سے ذکر کیا۔ اے بی حسرت کے والدین تو مان گئے لیکن بھوری کے والدین نہ مانے۔ ایک تو روئی دھنئے والے کا بیٹا، اوپر سے معذور، ہم تو کسی خوبصورت اور اچھے خاندان میں تیرا ہاتھ پکڑائیں گے۔ ہم تجھے موت کے حوالے کر سکتے ہیں لیکن اس کے حوالے نہیں کریں گے۔ آخر کار اے بی حسرت نے فیصلہ کرلیا اگر اس کا نہ ہوسکا تو کسی کا بھی نہیں ہوگا۔

....

مکڑا بہت شرمندہ تھا۔ مکڑی کو بھی احساس ہوا۔ مکڑے کی ایک ٹانگ کی کمی، مقابلہ برابری کا نہیں تھا۔ نسل کی ریت تو یہ ہے کہ ہارا ہوا مکڑا مکڑی کے ہاتھوں ہی موت قبول کرتا ہے لیکن مکڑی نے اس کو معذوری کی وجہ سے اسے کہا کہ میں تمہیں کبھی بھی نہیں ماروں گی۔ مکڑا وہاں سے فوراً بھاگ کھڑا ہوا اور انگریزی شیلف کے نیچے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت لائبریرین جس نے شیکسپیئر کی کتاب پڑھنے کے لیے اٹھائی تھی، وہی کتاب واپس شیلف میں To Be, Not To Be کہتے ہوئے رکھنے کے لیے آیا۔ جیسے ہی لائبریرین نے اپنا دایاں پاؤں اوپر اٹھایا، مکڑا بھاگ کر اسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں اس نے پاؤں رکھنا تھا۔ بھاری بھرکم پاؤں، لائبریرین کا وزن اتنا کافی تھا کہ مکڑے کو آسانی سے کچل سکتا تھا۔ مکڑے نے اپنی نسل کی آن کو بچانے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ دے دیا۔

....

تمام حربے آزما لیے لیکن کوئی تدبیر بھی بر نہ آئی۔ دونوں نے ایک ساتھ اپنی جان لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اے بی حسرت نے زہر کا بندوبست کیا۔ دونوں رات کو ایک ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں چلے گئے جس کی دیوار پیر دھجی شاہ کے دربار سے ملتی تھی۔ ارد گرد بھی کوئی نہ تھا۔ اے بی حسرت نے دو گلاسوں میں پانی ڈالا۔ اندھیرا کافی تھا لیکن دھجی دربار سے لائے ہوئے دو دیے اتنی روشنی دے رہے تھے کہ ایک دوسرے کے چہرے صاف دکھائی دیتے تھے۔ گلاسوں میں برابر کا زہر ڈال کر پانی میں تحلیل کر لیا۔ دونوں نے آخری بار ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھا، دیوں کی روشنی میں بھوری بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ دونوں نے زہر کے گلاس اٹھائے، آہستہ آہستہ گلاس لبوں کے قریب لے جانے لگے۔ جب دونوں کے ہاتھ تھوڑے سے اوپر گئے، بھوری نے جلدی سے گلاس لبوں سے لگا کر پورا زہر معدے میں انڈیل لیا۔ اے بی حسرت نے بھی اپنا گلاس ہونٹوں کی دہلیز پر رکھا ہی تھا کہ اس کا ہاتھ کانپنے لگا، ماتھے پر ابھری پسینے کی بوندیں دیے کی روشنی میں چمکنے لگیں اور بھوری

کے چہرے کو دیکھا، چہرے پر تکلیف کے ہلکے ہلکے آثار ابھرنے لگے۔ ٹھنڈے پسینے کی بوندیں موتیوں کی مانند جگمگانے لگیں، چہرہ اور بھی روشن ہو گیا۔ زہر رگوں سے ہوتا ہوا معدے سے جسم کی شریانوں کو کاٹنے لگا۔ ناک سے خون نکلا اور خون کی قے چیخ کے ساتھ نکلی۔ مجبوری کے چہرے کو اے بی حسرتؔ نے بڑی حسرت سے دیکھا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا، ہاتھ بھی کانپنے لگا، زہر کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ دہشت زدہ ہو کر کھنڈر سے نکل آیا۔ کھنڈر کے ساتھ پیر دبّجی شاہ کے دربار میں گیا تو بالکل اندھیرا تھا۔ ہاتھ لگا کے محسوس کیا تو پیر دبّجی شاہ کی قبر کے چبوترے کے چاروں طرف دیے بجھے ہوئے تھے۔ ایک دیا اٹھایا تو وہ خالی تھا۔ دوسرے دیے سے اس میں تیل انڈیلا اور باقی کو دیا سلائی سے روشن کیا اور وہاں سے یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ میں نے نسل انسانی کی ریت کے دیے کی منت پوری کر دی ہے۔

اے بی حسرتؔ نے پیر دبّجی شاہ دربار کی دہلیز سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک مکڑا تیزی سے اپنے جالے سے نکل کر بھاگا اور پھر رکا اور پھر بھاگ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے مکڑا یہ کہہ گیا ہو، شکر ہے میں انسان کی طرح زندہ نہیں ہوں۔

☆☆☆

شاپنگ مال

"Chill goes away"

پہلی دفعہ کا ذکر ہے، جب انگریز نے لنڈی کوتل کے مقام پر خٹک ڈانس دیکھتے ہوئے ایک خاص میوہ کھایا تو اس کی شریانوں کے ٹھنڈے خون میں تپش آ گئی۔ اس نے اس میوے کا نام خٹک ڈانس میں ناچتے ہوئے ''Chill goes away'' رکھ دیا جو بعد میں ''چلغوزہ'' بن گیا۔

اسی طرح اس نے اپنے یا اپنے وفادار جانثاروں کی شریانوں میں خون کی تپش لانے کے لیے جہاں جہاں فوج کی چھاؤنی بنائی، اس کے ساتھ انسانی لذت کے میوے کا چکلہ بھی کھول دیا تاکہ وفاداروں کا خون گردش میں رہے اور بجنے میں دقت نہ ہو۔ لیکن یہ میوہ کھانے کے بعد وہ ناچتے نہیں تھے اور شور نہیں مچاتے تھے بلکہ لمبے کوٹ کے کھڑے کالروں میں اپنا منہ چھپا کے آتے اور میوہ کھا کے منہ چھپا کے وہاں سے چلے جاتے۔ اسی مناسبت سے ایک سڑک کا نام جس پر چکلہ آباد تھا، اس کا نام ''کوٹ روڈ'' مشہور ہو گیا۔ چھاؤنی تو وہاں سے چلی گئی لیکن کوٹ روڈ وہاں موجود رہا۔

بالکل اسی طرح ایک انگریز افسر نے اسی شہر میں ایک یورپین انداز میں بہت بڑا محل بنایا جس کا نام اس نے ولڑلے ہاؤس رکھا، جیسے لائل پور، منٹگمری، ملکہ وغیرہ شہروں کے نام ہیں۔ انگریز تو وہاں سے چلا گیا لیکن اس کا ولڑلے ہاؤس وہاں موجود رہا۔ انگریز افسر نے جاتے ہوئے ولڑلے ہاؤس اپنے ایک وفادار کو بخش دیا بلکہ اس کی وفاداری سے اتنا خوش تھا کہ اسے اعزازی کرنیل کا رتبہ بھی دے دیا کیونکہ دوسری جنگ عظیم میں اس وفادار نے بہت زیادہ فوجی انگریز سرکار کو مہیا کیے تھے لہٰذا بختیار خاں کا نام کرنیل بختیار خاں ہو گیا۔

ولڑلے ہاؤس اور کوٹ روڈ میں کچھ کرتے بہت ملتے تھے۔ مثال کے طور پر وہاں کے باسی دن بھر سوتے، رات کو چہل پہل اور کاروبار زندگی عروج پر ہوتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں جگہوں میں کچھ تبدیلی آنا شروع ہو گئی، یعنی کوٹ روڈ شہر کی آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ بالکل شہر کا حصہ بن گیا لیکن کوٹ روڈ کے بسنے والے وہیں موجود رہے اور اپنا کاروبار نئے انداز سے جاری رکھا۔ ولڑلے ہاؤس آبادی سے ذرا دور تھا۔ ولڑلے ہاؤس کے صاحبوں اور بیگمات کی بہت عزت تھی۔ بیگمات کو خاص طور پر بہت احترام سے دیکھا جاتا بلکہ بالکل نہ دیکھا جاتا۔ جب بھی بیگمات ولڑلے ہاؤس کے علاقے سے گزرتیں، مرد حضرات پردے میں چلے جاتے۔ ولڑلے ہاؤس کی شان و شوکت میں قدرے کمی آنی شروع ہو گئی۔ اس کی وجہ کرنیل بختیار خان کی اولاد تھی۔ وہ کوئی کام کاج تو کرتے نہیں تھے، بس جو جائیداد تھی اسے بیچ بیچ کر زندگی عیش و عشرت سے بسر کرتے۔

ساری جائیداد بک جانے کے بعد ولڑلے ہاؤس کے مکینوں کا آخری سہارا ایک فارم رہ گیا تھا جسے وہ بیچ نہیں سکتے تھے۔ وہ فارم انگریز سرکار نے گھوڑوں کی خاص نسل کی افزائش کے لیے اپنے وفاداروں کو گھوڑیال سکیم کے تحت دے رکھا تھا۔ گھوڑے پالنے کا شوق ہی تباہی کا باعث بنا کیونکہ ریس کے جوئے کی بری لت نے تمام جائیداد کو بربادی کی نذر کر دیا۔ وہی اکلوتا فارم اب ولڑلے ہاؤس کا واحد سہارا تھا۔ ہر وقت کا دھڑکا کہ نئی حکومت اسے واپس نہ

لے لے کیونکہ گھڑ پال سکیم دوسرے علاقوں میں تو ختم ہو چکی تھی لیکن کرنیل بختیار خاں کی اولاد اپنے اثر ورسوخ سے اس پر قابض تھی۔ جب بھی حکومت بدلتی تو کوئی نہ کوئی وزیر یا تو ان کا رشتہ دار ہوتا یا قریبی دوست جوان کے مفادات کو بچالیتا۔

سفید فام حکمرانوں نے اپنی حکومت گندمی فام حکمرانوں کے حوالے کردی۔ ان کی تربیت کے لیے انگریزوں نے ہر شہر میں ایک تربیت گاہ قائم کی جہاں یہ گندمی فام امراء وڈیرے ہی صرف تعلیم حاصل کر سکتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مشینی انقلاب کی ترقی سے جب دولت کی تقسیم عام لوگوں میں بھی ہونے لگی تو ان لارڈز کی تربیت گاہوں میں ٹھیکیداروں، آڑھتیوں اور دوسرے کاروبار کرنے والوں نے بھی اپنے بچوں کو خاندانی امراء کی فہرست میں شامل کرنے کے لیے لارنس کالج، ایچی سن، سیکرڈ ہارٹ، برن ہال نامی تربیت گاہوں میں بھیجنا شروع کر دیا۔ یوں سمجھ لیجیے ہر پیسے والا جوان تربیت گاہوں کے بھاری اخراجات برداشت کر سکتا، وہاں پہنچ جاتا۔ اسی لیے کوٹ روڈ کے باسیوں کی ایک شمیم آراء نے بھی وہاں سے تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی تا کہ امیروں سے راہ و رسم میں آسانی رہے۔ شمیم آراء کی ماں اپنے زمانے کی پری چہرہ نسیم تھی۔ اس کے پری چہرے کو کسی دل جلے نے تیزاب سے جلا دیا تھا۔ وہ کبھی کسی کو تیزاب سے جلے چہرے کے بارے میں نہیں بتاتی تھی جسے ہمیشہ شمیم آراء پڑھنے کی کوشش کرتی تو اس کی ماں اس حادثے کی کتاب کو کھولنے کے بہانے سے بند کر دیتی۔

شمیم آراء اپنے آداب واطوار سے بالکل کوٹ روڈ گھرانے سے آئی ہوئی نہیں لگتی تھی۔ تعلیم وتربیت، بات کرنے اور پہناوے کا سلیقہ ہمیشہ دھوکہ دیتا کہ اس کی رگوں میں کسی بہت بڑے خاندان کا خون دوڑتا ہے۔ خوبصورت اتنی کہ لوگ دیکھتے ہی اپنے ہونٹ کاٹ لیں۔ بادام نما آنکھوں پر لمبی پلکوں میں کھیلتے بلوری بنٹے، ستواں ناک اور ناک میں انگی ہیرے کی تھنی جیسے ہلال احمر میں جھلملاتا ستارہ۔ شمیم آراء کی دوستی وٹر لے ہاؤس کی

شہر بانو سے بہت زیادہ تھی۔ دونوں ذہانت اور حسن میں اپنی مثال آپ تھیں۔ بس دونوں کو دیکھتے ہی دل والے اپنا دل قدموں میں رکھ دیتے۔ شہر بانو کو شمیم آراء کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا اور نہ ہی شہر بانو کچھ معلوم کرنا چاہتی تھی۔ دونوں کو انگریزی ادب میں خاصی دلچسپی تھی۔ ایک دوسرے سے کتابیں تبدیل کرتیں اور بحث لگاتیں۔ ادب اور آرٹ تھیٹر سے لگاؤ کی تسکین ہمیشہ شیکسپیئر کے ٹوننگی تھیٹر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے کر کرتیں اور جوش و جذبے سے کوئی نہ کوئی شیکسپیئر کا کردار ادا کرتیں۔ لیکن اس تربیت گاہ میں ایک کیرکٹر اسد ضمیر بھی تھے۔ اسد ضمیر نہیں بلکہ صاحبزادہ اسد ضمیر۔ چھوٹے نواب صاحب کالا افغانہ ریاست کے نواب کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ ملک کے بٹوارے کے بعد ان کو پہلے سے بھی زیادہ جائیداد الاٹمنٹ میں مل گئی۔ بگڑے نواب کے اطوار خاصے نامناسب تھے۔ غرور اور بدتمیزی ہمیشہ ان کے کوٹ کی باہر والی جیب میں ٹنگے ہوئے بورگیڈ کے سرخ رومال کی طرح ہر ایک کو دور سے متوجہ کر دیتی کہ اسد ضمیر وہاں موجود ہیں لیکن تھا وجیہہ و شکیل جو بالکل ٹاٹ کی شخصیت پر مخمل کی ترپائی کا کام کرتا تھا۔ جب بھی تربیت گاہ میں آتا، ساتھ میں اس کا ملازم ایک شکرے کو اپنے چمڑے کے دستانے میں چھپے ہاتھ پر بٹھا کے ساتھ لاتا۔ شکرے کی آنکھیں چمڑے کے کٹوروں سے ڈھکی ہوئی تھیں، بالکل اپنے مالک کی طرح جو اپنی آنکھیں گہرے رنگوں والی عینک میں چھپائے رکھتا تھا۔ تربیت گاہ میں گھسنے سے پہلے وہ اپنی لمبی کار میں شکرے کو پیار کرتا، اسے چڑیوں کا گوشت اپنے ہاتھ سے کھلاتا اور خود شکرے کی طرح تربیت گاہ کو شکارگاہ سمجھ کر گھس جاتا۔

اسد ضمیر ہمیشہ شمیم آراء اور شہر بانو کے گرد منڈلاتا رہتا۔ ہر روز نئے نئے ڈائیلاگ رٹ کر اپنی کتابی دلچسپی کا جھوٹا ڈھونگ رچاتا رہتا لیکن وہ دونوں اس سے بہت نفرت کرتی تھیں۔ ایک دن شمیم آراء کو اکیلے پا کر اس پر اپنے کتابی مطالعے کا رعب ڈالنے لگا:

"چچ چچ چچ چچ .... بہت زیادتی کرتی ہیں آپ۔"

شمیم آ راء نے حیران ہو کر دیکھا...... "کیا مطلب؟"

"اس چہرے کی کتاب پہ غصے کا کور بھلا نہیں لگتا۔"

شمیم آ راء نے طنزیہ لہجے میں مسکرا کر جواب دیا "یہ چہرہ کھلی کتاب ہے، اس چہرے کے دل میں اگر کسی سے نفرت ہے تو چہرے کے اوراق پر ابھرے ہوئے الفاظ خاصے نمایاں ہیں اور اگر اگلی دفعہ کسی سے ڈائیلاگ لکھوا کے لاؤ تو اس سے کہنا جین آسٹن (Jane Austin) کی کتابوں کی چوری مت کرے۔"

اسد ضمیر اپنے ضمیر کو ملامت کرتا ہوا اپنا سا چہرہ لیے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ شمیم آ راء اور شہر بانو کا ہمیشہ کی طرح اسد ضمیر محور گفتگو رہتا اور ان کا یہ کامیڈین ولن انہیں خاصا محظوظ کرتا۔

ایک دن شمیم آ راء کچھ اداس سی تھی۔ شہر بانو نے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی تو ٹال گئی۔ غور سے دیکھا تو ناک میں پتلی سی کالے رنگ کی ڈوری بندھی تھی۔ بات آ ئی گئی ہو گئی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ ڈوری غائب ہو گئی اور اس کی جگہ ہیرے کی تھنی نے لے لی جو اس پر بہت جچتی تھی۔ اسد ضمیر اپنی حرکات سے باز نہ آیا بلکہ ان حرکات میں اور بھی تیزی آنے لگی۔ خوامخواہ دونوں کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا۔ ایک دن تو اس نے حد ہی کر دی۔ شہر بانو کو اکیلا دیکھ کر اپنی محبت کا بے سرا راگ الاپنے لگا۔ اپنے ایک گھٹنے کے بل آدھا کھڑا آدھا بیٹھ کر جیب سے بہت مہنگی انگوٹھی نکال کر شہر بانو کو پیش کی اور بہت بھونڈے انداز میں کہا "میری محبت کی یہ نشانی قبول کر کے میرے پاؤں میں میرے شکرے والی ڈوری باندھ دیں اور میں ہمیشہ آپ کے ہاتھ پر آنکھیں بند کیے بیٹھا رہوں گا۔" باقی کے ہم جماعت بھی اس ڈرامے کے سین کو دیکھ رہے تھے۔ شہر بانو نے اسے اپنی ہتک محسوس کی اور غصے میں آگ بگولا ہو گئی اور بے قابو ہو کر زناٹے کا ایک زوردار تھپڑ ثبت کیا جس کی آواز سے درختوں پر بیٹھے کبوتر اور اسد ضمیر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ تھپڑ کی آواز کی گونج بڑی دیر تک آڈیٹوریم میں پھڑپھڑاتی رہی۔ اسد ضمیر بے قراری میں اِدھر اُدھر دو چلو پانی

ڈھونڈنے لگا تا کہ بے شرمی سے اس میں ڈوب کے مر سکے۔ نواب آف کالا افغانہ کے لیے یہ بہت بڑی بے عزتی کا مقام تھا۔ اس نے شہر بانو کے غرور کو نیچا دکھانے کی ٹھان لی۔ ہر تدبیر کرنے کے لیے تیار ہو گیا خواہ اس میں وہ سب کچھ ہی کھو دیتا۔ سب سے پہلے اس نے اپنی والدہ سے شہر بانو سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ والدہ بہت ہی خوش ہوئیں اسد ضمیر کی والدہ اور والد اس کا رشتہ لے کر شہر بانو کے گھر گئے لیکن اس کے بھائی نے رشتہ سے انکار کر دیا۔ صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ لڑکے کے چال چلن اچھے نہیں ہیں۔ جب اسد ضمیر کے والد نے بیٹے کے حصے کی جائیداد شہر بانو کے نام کر دینے کی پیشکش کی تو شہر بانو کے بھائی میں تھوڑی سی لچک آئی لیکن بہن کی رضامندی کے خلاف فیصلہ دینا مشکل تھا اور چھ دنوں کی مہلت مانگی۔

اسد ضمیر ہر ممکن طریقے سے ہر قیمت پر شہر بانو سے انتقام اس سے شادی کر کے لینا چاہتا تھا۔ اس نے جب کھوج لگایا تو معاملہ اور بھی آسان ہو گیا کیونکہ ولڑ لے ہاؤس کے جنازے کے پائے تو گھڑیال سکیم کے کندھوں پر رکھے تھے۔ اس نے فوراً اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے حکومت کی طرف سے گھڑیال فارم کے بند کرنے کا نوٹس بھجوا دیا۔ اس خبر نے ولڑ لے ہاؤس کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ شہر بانو کے بھائی نے فوراً گھر کی عزت اور لاج بچانے کیلئے بہن کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے کہ رشتے کو قبول کر لو۔ ویسے بھی نوابوں کا خاندان ہم سے بہت اونچا ہے۔ ساری عمر عزت اور عیش کی زندگی بسر کرو گی۔ شہر بانو نے اپنی زندگی کے سب سے اہم فیصلے کا کڑوا زہر بڑی مشکل سے نگل لیا۔ اسد ضمیر کے والدین نے ولڑ لے ہاؤس والوں کی سب شرطوں کے ساتھ شہر بانو کی دودھ پلائی کی بھاری شرط کے ساتھ سب قبول کر لیا۔ صرف شمیم آرا ہی اس کے دکھ کو سمجھ رہی تھی اور رو رو کر یہ کہہ رہی تھی کہ مجھ میں اور شہر بانو میں کوئی فرق نہیں۔ اس نے شہر بانو کو سرخ ڈبیہ میں بند ایک کالی ڈوری تحفے میں دی۔ شادی کا دن مقرر ہو گیا۔ بہت دھوم مچ گئی اس شادی کی۔ شادی کی خبر کا شور اخباروں کی

سرخیوں سے لے کر ٹیلیویژن کے زنانہ پروگراموں کا موضوع بنا۔ زنانہ رسالوں کے باہر والے صفحات پر دونوں کی تصویریں چھپیں۔ ولز لے ہاؤس کو دلہن کی طرح سجایا گیا اور دلہن کو قربانی کی گائے کی طرح سجایا گیا، جو قربانی والی عید سے پہلے مہندی کے ڈیزائن بنائے جاتے ہیں اور سر پر سرخ رنگ کے ڈوپٹے باندھے جاتے ہیں۔ تیاریاں زوروں پر تھیں، میک اپ کے لیے ایک ٹیم ہالی وڈ سے منگوائی گئی۔ دلہن کا عروسی جوڑا فرانس کے ڈیزائنروں نے ڈیزائن کیا۔ دلہن کی جوتی نایاب گلہری کی کھال میں موتی جڑے اٹلی سے بنوائی گئی۔ ہندوستانی جوہریوں نے زیورات ڈیزائن کئے۔ دعوتوں کا سلسلہ پانچ دن پہلے سے شروع ہو گیا۔ دعوت میں استعمال ہونیوالی شرابیں پچاس سال پرانی منگوائی گئیں۔ سوسالہ شیمپین سے جشن کے افتتاح کا اہتمام ہوا۔ کیوبا سے سگار لپیٹنے والے منگوائے گئے تاکہ تازہ سگار پیش کئے جائیں اور اسد ضمیر ہاتھی پر بیٹھ کر اپنی بارات کے ساتھ شہر بانو کو لینے آیا۔ رسومات کے بعد دولہا اپنی دلہن کو اپنے گھر لے گیا۔ رات کو دلہن کے کمرے میں دلہن سے ملنے گیا تو دلہن خاموش سدھ بدھ پھولوں کی سیج پر لمبا گھونگھٹ لیے بیٹھی تھی۔ اسد ضمیر نے جب دلہن کا ہاتھ گھونگھٹ سے باہر نکلا دیکھا تو اسے دودھ پلانے والی رسم کی شرط یاد آ گئی اور فوراً 25 لاکھ کا چیک شیروانی کی جیب سے نکال کر دلہن کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

ابھی وہ اپنا ہاتھ میز پر رکھے دودھ کے گلاس کی طرف بڑھا ہی رہا تھا کہ اُسے گلاس کے ساتھ شمیم آراء کے تحفے کی سرخ ڈبیہ کھلی ہوئی پڑی تھی تو شہر بانو نے اپنا گھونگھٹ اٹھا کے بند آنکھوں سے اپنا چہرہ اوپر کی جانب کر دیا۔ اسد ضمیر نے دیکھا کہ دلہن کی ناک میں ہیرے کی نتھنی بجائے چھوٹی سے کالی ڈوری بندھی تھی۔

شہر بانو نے دبے الفاظ میں کہا:......

''تمہیں میری نتھ کھولنے کا پورا اختیار ہے۔''

☆☆☆

مطلب کیا

ستو سلطان کا میلہ ہر سال پھاگ کے مہینہ میں بڑی شان بان سے لگتا ہے۔ ستو سلطان دربار کے عقیدت مند بیسیوں میل چل کے اپنے مرشد کی زیارت کے لیے حاضری دینے آتے۔ پاکستان بننے کے بعد ستو سلطان کا نام سلطان آباد میں تبدیل ہو گیا تھا۔ کیونکہ ست نام ہندوانہ تھا اور سلطان مسلمان۔ سینتالیس والے غدر میں جب بہت جانیں ضائع ہوئیں تو ستو سلطان دربار کے مجاوروں نے دربار کا نام سلطان آباد رکھ دیا۔ اس دربار کے کرتا دھرتا پہلے ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ لیکن ستو سلطان کے مسلمان گدی نشینوں نے یہ فیصلہ کیا۔ کہیں بعد میں کوئی ہندو گدی نشین اپنا حق نہ جتائے اور حصہ کا کلیم دائر کر دے۔ انہوں نے اس کا نام بدل دیا۔ ست نام اور سلطان دونوں مرشد اور مرید تھے۔ مرید اپنے مرشد کے وسیلے سے خدا تک رسائی لیتا دونوں کی کرامات علم اور روحانیت سے ان کا رتبہ یکساں تھا۔ ہر مسلک کے لوگ ہندو، سکھ، عیسائی، مسلمان سب عقیدت سے سرشار زیارت کو آتے۔ دونوں کی قبریں دربار کے اندر ساتھ ساتھ تھیں۔ جو بعد میں مسلمان گدی نشینوں نے صرف ایک کر دی تھیں۔

اس علاقے کے لوگ سلطان آباد کے میلے کا پورے سال انتظار کرتے۔ لیکن احمد کبیر تو بس شیدائی تھا۔ اسے دربار سے انس تو تھا ہی۔ لیکن کبڈی کے میچ کی دستار بندی کی جیت کے لیے وہ سارا سال تیاری کرتا۔ ہر شام کھیتوں سے فارغ ہو کر اپنی ٹیم کے ساتھ تیاری میں جت جاتا۔ خوب پریکٹس کرتا وہ تھا سلطان آباد کا رہنے والا۔ گاؤں کی عزت کی پاسبانی جیسے اپنی زندگی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہو۔

ہفتہ پہلے ہی احمد کبیر کی بیوی نے کپڑے دھونے والے خوشبوئی صابن سے کپڑے دھو دیے، چار دن میلہ خوب دھوم سے لگتا۔ آخری دن صرف عورتوں کے لیے وقف ہوتا۔ جس میں کسی مرد کو میلے کے بازار میں جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ لیکن عورتوں کو ہر روز جانے کی اجازت تھی۔ کبڈی کا میچ ہر روز سہ پہر سے شروع ہو کے سورج ڈھلے تک جاری رہتا۔ میچ شروع ہونے سے پہلے ریچھ اور کتے کی لڑائی کے لیے، پکھی واس پہلے ہی سے اپنی پکھیاں میلے والی جگہ پہ لگا دیتے۔ پکھی واسوں کی عورتیں دن میں مٹی کے کھلونے، گھگھو گھوڑے، کانے کی تکی ٹانگوں والا گھوڑا، ڈگ ڈگ کرتا ریڑھا، انہی عارضی دکانوں پہ خوب بیچتیں۔

احمد کبیر پورا سال گڑ کی کمائی کے آدھے پیسے میلے پہ خرچ کرنے کے لیے رکھ چھوڑتا۔ کچھ پیسے بیوی کو دیتا جو وہ میلے سے برتنوں کی خریداری پہ صرف کر دیتی۔ لیکن اسے سارا سال سرخ اور سبز رنگ کے شربت میں ڈوبے ہوئے برف کے گولے کھانے کا انتظار رہتا۔ زندگی میں پہلی دفعہ برف والا پانی اس نے اپنی شادی پر پیا تھا۔ میٹھے رنگدار برف کا ٹھنڈا گولا چوسنے کا خیال آتے ہی اس کے منہ میں پانی بھر آتا۔

احمد کبیر اسے سرکس میں ایک پینگ سے دوسری پینگ پہ جھولنے والی لڑکی کی کہانی سناتا۔ بڑے جوش سے بات کرتا کہ اس میں تو ہڈی نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ وہ بالکل ربڑ کی طرح دوہری ہو کر اپنے پاؤں کو پیچھے کمر کی طرف سے چھوتی ہوئی قلابازیاں لگاتی

ہے۔ تو جب وہ اپنی بیوی کی آنکھوں میں حسرت کی جھلک دیکھتا تو وعدہ کرتا اگلے سال ضرور سرکس دکھائے گا۔

چاروں دن وہ میلے میں گزارتا۔ تیسرا دن عورتوں کا ہوتا تو اس دن اپنی بھاگ بھری کو لے جاتا۔

دربار سے لے کر پکی سڑک تک عارضی دکانوں کا بازار سجتا۔ پکی سڑک پر سلطان پور کا سٹاپ تھا جہاں ساری بسیں رکتیں سواریاں اتارنے اور چڑھانے کے لیے، وہاں پندرہ بیس منٹ کا سٹاپ بھی لگاتیں۔ اسی سٹاپ پہ عبدالغفار کا چائے کا کھوکھا تھا۔ کھوکھے میں مٹی کے تیل کے تین اسٹوو تھے۔ ایک پر چائے کی بہت بڑی کیتلی جس میں چائے کی پتی نہ بھی ڈالو پھر بھی کیتلی کے اندر کی دیواریں چائے کی رنگت اختیار کر گئی تھیں، دوسرے اسٹوو پر کڑھتا ہوا دودھ جو شیشے کے گلاسوں میں پڑی چائے کے مکھڑے کو چن ورگا بنا دیتا۔ تیسرے اسٹوو پر گرم پانی کا پتیلا۔ جو استعمال شدہ برتنوں کے دھونے کے کام آتا۔ ان پتیلوں اور کیتلیوں کے سامنے مرتبانوں کی قطار جس میں رس کیک، بسکٹ، پیسٹریاں سجی ہوئی ہوتیں جنہیں بغیر چائے میں ڈبوئے دانتوں سے توڑنا خاصا جدوجہد کا کام ہوتا۔

عبدالغفار احمد کبیر کا دور پار کا رشتہ دار تھا۔ میلے کے دنوں میں احمد کبیر اسی کے ہاں قیام کرتا۔ سارا دن میلے میں مصروف، سہ پہر سے شام کبڈی کا میچ اور ساری رات گامن اور منظور جھلے کی تھیٹر میں گزارتا۔

اس سال بھی حسب معمول میلے پہ جانے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اگر پیدل سلطان پور کے دربار آتا تو پورے دس کوس کا فاصلہ تھا۔ لیکن کچھ تفریح کے لئے اس نے پکی سڑک پہ آ کے بس سے جانے کا ارادہ کیا۔ فاصلہ تو دوگنا تگنا ہو جاتا لیکن وقت اتنا ہی لگتا کیونکہ بس ہر سٹاپ پہ رکتی تھی اور سڑک بھی شیر شاہ سوری کے بعد کسی نے درست نہیں کروائی تھی۔ بس میں چڑھا تو سب سے پچھلی سیٹ ملی۔ جو وہ عقلمندی کرتے ہوئے چھوڑ کر

بس کے درمیان میں کھڑا ہو گیا۔ ورنہ اس کی انتڑیاں دماغ کی سیٹ سنبھال لیتیں۔ اور دماغ شاید ٹخنوں میں پڑا ہوتا۔ ابھی اپنے آپ کو درست کر ہی رہا تھا کہ ایک دانتوں کا منجن بیچنے والا درمیانی دروازے سے اندر گھس آیا جو میلے میں منجن بیچنے آ رہا تھا۔ بھری بس دیکھ کر موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تقریر شروع کر دی۔ بھائی جان، مہربان، قدر دان۔

گل اے سانوں سیانیاں نے دس ی
دند جے خراب ہون تے کڑی نہیں جے ہسدی

پوری بس کے مردوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اور عورتوں نے مسکراتے ہوئے سر نیچے جھکا لیے۔ سب کو اس نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، اور زوردار آواز میں سب کو چپ کروا دیا۔

یہ بات ہنسنے کی نہیں ہے...... بھائی جان آپ چار لوگوں میں کھڑے بات کرتے ہیں منہ سے بدبو آتی ہے۔ ایک صاحب آپ کو کہہ دے گا۔ بھائی صاحب منہ پرے کر لو۔ آپ کے منہ سے بدبو آتی ہے۔ پھر ترنم سے گانا گایا۔

ساری رات تڑپدیاں لنگھ جاندی۔

تسیں درد دے مارے نہیں سوندے۔ صبح اٹھتے ہو کلی کرنے بیٹھتے ہو۔ منہ سے پانی خون کے ساتھ نکلتا ہے۔ زور سے تالی بجا کر انگلیوں کو دوسرے ہاتھ سے ہلا کر کہا۔ دانت ہلتے ہیں۔ پانی ٹھنڈا لگتا ہے۔ دانتوں کی سب بیماریوں کا علاج یہ جھنڈو منجن ہے۔ اس کی قیمت چار روپے ہے۔ لیکن کمپنی کی مشہوری کے لیے دو روپے، صرف دو روپے، بھائی جان دو روپے۔ ایک منٹ بی بی جی میرے پاس مال بہت کم ہے ابھی آیا۔

احمد کبیر کو یوں لگا جیسے یونین کونسل کا ممبر ووٹ مانگنے کے حربے استعمال کر رہا ہو۔

احمد کبیر نے اپنے تہبند کی ڈب میں بندھے ہوئے پیسوں پہ ہاتھ مارا۔ چلو ایک

منجن کی بوتل لے لوں۔ بھاگ بھری ہمیشہ دانت کے درد کی شکایت کرتی ہے۔ اور یہ سوچ کر رک گیا۔ اس کا درد تو لونگ دانتوں میں دبانے سے دور ہو جاتا ہے۔ گھر جا کے کپاس کی لکڑی کے کوئلے میں نمک ملا کے دے دوں گا۔ اس منجن سے تو وہ ہزار درجے بہتر ہے۔

بس سے اتر کر سیدھا عبدالغفار کے کھوکھے پہ پہنچا۔ خیر خیریت پوچھنے کے بعد عبدالغفار نے اصرار کیا کچھ دیر آرام کر لو۔ شام کو اکٹھے دربار پر دیا جلانے کی رسم میں شمولیت کریں گے۔ احمد کبیر نے کھوکھے کے ساتھ پڑی ہوئی چارپائی بلکہ بہت بڑی چارپائی جو ایک انسان کے لیے بلکہ سلمان جن کے ستانے کے لیے بچھائی گئی تھی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سات دس انسانی جسم آرام سے اس پر لیٹ سکتے تھے۔ احمد کبیر نے سر پہ بندھی پگڑی کو لپیٹ کر سر کے نیچے تکیہ بنا کر آنکھ لگا لی۔

شام ہوئی تو مردوں اور عورتوں کی ٹولیاں اپنے مرشد کی شان میں قصیدے گاتے دربار پہ پہنچیں۔ یہ بڑا مشکل وقت ہوتا۔ سب مریدوں کے لیے بھی اور مرشد کے لیے بھی۔ دربار کی چھت کے درمیان میں گنبد کی چار دیواری پہ دیئے جلائے جاتے تھے۔ پہلا دیا سلطان پور کا گدی نشین اپنے ہاتھ سے جلاتا اور اگر پہلا دیا بجھ جاتا تو سننے میں آیا ہے اسی سال گدی نشین کا انتقال ہو جاتا تھا۔ کہتے ہیں اس ریت کی پاداش میں دربار کے لواحقین گدی نشین نہ بھی مرتا تو اسے زبردستی مار دیتے۔

بس ایک عجیب سماں تھا سارے مرید جھوم جھوم کے گدی نشین کی زندگی کے لیے دعا مانگ رہے تھے۔ عورتوں کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے پیرو مرشد کے لیے دعا گو تھے۔ لیکن خدا کے شکر سے گدی نشین دیا جلانے میں کامیاب ہو گیا۔ خوشی کا ایک جشن منایا گیا۔ آتش بازوں نے شرلیاں، پٹاخے، پھلجھڑیاں اور اناروں سے پھوٹتی ہوئی پھول کی چنگاریوں سے گھپ اندھیرے کو دن کا سماں بنا دیا۔

اس سب ہنگامے میں ایک اوسط عمر عورت جس کا جنم اونیوں والے سال میں عین

اس وقت ہوا تھا۔ جب پاکستان بننے کا اعلان ہوا۔ سبز رنگ کی شلوار قمیض میں علیحدہ بیٹھی یونہی خوش ہو رہی تھی جیسے یہ سب کچھ اس کے جنم دن کی خوشی میں منایا جارہا ہے۔ نہ جانے کیوں احمد کبیر کو اس باوقار عورت کو دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ اس کی ماں ہو۔ یہ رات بس میلے کے افتتاح کی رات تھی۔ جشن کے بعد ساری رونقیں میلے میں واپس آ گئیں۔ تھیٹریکل کمپنیوں کے لاؤڈ سپیکر پر فلمی گانے بجنے شروع ہو گئے۔ تھیٹروں کے مین گیٹ کپڑے کے بنے بورڈوں سے آویزاں تھے۔ گیٹ کے بالکل ساتھ اونچا سا بانسوں کے مچان پہ لکڑی کے پھٹوں پر ایک مرد، زنانہ کپڑوں میں ملبوس جس کا چہرہ میک اپ کی تہہ میں یوں لگ رہا تھا جیسے پلاسٹک کے لوٹے پر سرخ رنگ کی گاڑھی لپ۔ اسٹک کا استعمال کیا گیا ہو۔ اچھل اچھل کر کولہے ٹھمکا کر "چھڈ میری وینی نہ مروڑ" کے سپیکر میں بجنے والے ریکارڈ پہ ہونٹوں کو گانے کے ساتھ ہلا کے یہ بتانے کی بھرپور کوشش میں تھا کہ گانا نور جہاں نہیں وہ خود گا رہا ہے۔ ٹھمکا دیکھ کے احمد کبیر کا دل مچل اٹھا اس نے پھر تہبند کی ڈب میں بندھے پیسوں پہ ہاتھ مارا۔ پھر یہ سوچ کے ہاتھ کھینچ لیا۔ ارے یہ کیا ناچے گا۔ جو میری بھاگ بھری نے میرے سالے کی کڑمائی پہ ایسا یادگار بھنگڑا ڈالا تھا۔ ابھی بھاگ بھری کے خیالوں میں تھا کہ عبدالغفار تھیٹر کے دو پاس لے آیا اور دونوں کو جگہ بھی عبدالغفار کی واقفیت کی بنا پر منی کے سٹیج کے قریب کرسیوں پہ مل گئی۔ باقی سب لوگ زمین پر بیٹھے تھے۔ احمد کبیر کو کرسی پر بیٹھنے میں فخر محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اسے مزہ نہیں آ رہا تھا۔ ہر پانچ منٹ کے بعد پہلو بدل رہا تھا۔ آخر کار اس نے جوتے اتار کر دونوں لاتیں موڑ کر سینے سے لگا لیں اور اپنی پگڑی کو رسی کی طرح کمر اور لاتوں کے گرد باندھ لیا اور حقے کی طلب عبدالغفار کے دیے ہوئے کے ٹو کے سگریٹ نے پوری کر دی۔ جسے وہ ہاتھ کو مٹھی بنا کر چھنگلی انگلی میں پھنسا کر زور سے کش کھینچتا۔ عبدالغفار کھوکھے کے گلے سے روپوں کے کافی سارے نوٹ ساتھ لے آیا تھا۔ آدھے اس نے احمد کبیر کو دے دیے۔ جو اس نے نہ نہ کرتے ہوئے رکھ لیے۔ منی کے سٹیج

کے ایک کونے میں سازندوں کی ٹولی بیٹھی تھی ایک مائیکروفون ہارمونیم پہ اوپر رکھا تھا۔ جس میں سے موسیقی کی ساری کمپوزیشن میں ہارمونیم کی پیں پیں کانوں کے بند پرتالوں کو کھولنے میں مدد دے رہی تھی۔ سٹیج کے پچھلی طرف بہت بڑے بانس پر مختلف مناظر کپڑے پہ لپٹے ہوئے تھے۔ جو کھیل کی مناسبت سے بدلتے رہتے۔ سٹیج کے وسط میں مائیکروفون لٹکا ہوا تھا۔ جو سب اداکار کوشش کرتے کہ وہ اپنا مکالمہ مائیکروفون پہ بول کے دوسرے کو وہاں آنے کے لیے جگہ چھوڑ دیتے۔ کھیل محمد بن قاسم کی فتوحات پر مبنی تھا۔ جنگ و جدل کے مناظر سے بھرپور تھا۔ لیکن سب سے زیادہ مسخرے نے تماشائیوں کو ہنسایا۔ جو نقلی محمد بن قاسم بن کے لوگوں سے پیسے بٹورتا۔ آخر میں اس کی ماں نے نقلی ہونے کا پول یہ ڈائیلاگ بول کے کھول دیا۔ ماں مراثن پتر محمد بن قاسم۔ ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک ڈانس کا آئٹم بالی جٹی کی چھلانگ سے شروع ہوتا۔ لیکن ہر دو منٹ کے بعد اسے رکنا پڑتا۔ کیونکہ کوئی نہ کوئی تماشائی ایک روپے کی ویل دیتا۔ عبدالغفار اور احمد کبیر نے سب سے زیادہ پیسے لٹائے۔ کیونکہ کرسیوں پہ بیٹھنے کی لاج بھی تو رکھنی تھی اور جب احمد کبیر کا نام سٹیج کا منتظم اس طرح سے پکارتا حاضرین تھیٹر بالی جٹی کے کام پہ خوش ہو کر جناب احمد کبیر کا انعام اور جناب عالی کا شکریہ۔ تو احمد کبیر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ سورج کی سرخی سے تھیٹر کے ختم ہونے کا اعلان ہو گیا۔ دونوں تھکے ہارے آ کے کھوکھے کے ساتھ باہر پڑے سلمان جن کی چارپائی پہ سو گئے۔ کھوکھا عبدالغفار کے بیٹے نے کھولا۔ دونوں دوپہر تک سوتے رہے۔ سہ پہر کو احمد کبیر کو کبڈی کا میچ کھیلنا تھا' لہٰذا اپنی ٹیم کے ساتھ بندھے پڑ میں کوڈی کوڈی کرتے مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں میں سے کسی ایک کو ہاتھ لگا کے پھرتیلے چیتے کی طرح نکل جاتا۔ سارے کے سارے میچ احمد کبیر جیت گیا۔ دستار بندی کے ساتھ سب سے زیادہ پوائنٹس جیتنے پر احمد کبیر کو پانچ ہزار کا انعام دیا گیا۔ فوراً بھاگ بھری کو اطلاع دے کر بلوا لیا۔ کہ جی بھر کر میلے میں برتن خرید لینا اور جتنے چاہے برف والے گولے کھا لینا۔

میلے کے آخری دن صبح کو وہ یوں ہی گشت پر تھا تو احمد کبیر کو میلے سے ذرا دور پکی سڑک کے قریب لوگوں کے ایک جھمگٹے نے اپنی طرف مبذول کروایا۔ سب لوگ ایک دائرے میں کھڑے تھے اور وسط میں ایک شخص لیٹا تھا۔ جسے سفید چادر نے ڈھانپا ہوا تھا۔ چادر میں ڈھکے شخص کے پیروں کی طرف کھڑا ایک شخص اپنی تقریر کر رہا تھا۔ احمد کبیر سمجھ گیا کہ یہ کوئی مجمع باز ہے۔

مجمع باز نے زور سے کہا۔
گھوم کے آ...... لیٹے شخص نے جواب دیا۔
آ گیا...... مجمع باز نے پھر پوچھا...... میں کون؟...... لیٹے شخص نے کہا...... عامل
مجمع باز نے پھر پوچھا...... جو پوچھوں گا، بتائے گا......
ہاں بتاؤں گا......
مجمع باز نے ایک بڑا چھرا اپنے تھیلے سے نکالا...... اور چادر کے اندر لیٹے شخص کی گردن پر چادر کے اندر چھرا پھیرا اور گردن دھڑ سے علیحدہ کر دی...... چھرے پہ خون لگا تھا۔ ایک سناٹا چھایا ہوا تھا...... لوگ بڑی خاموشی سے تماشا دیکھ رہے تھے...... مجمع باز نے اپنے پاؤں کو سر اور دھڑ کے درمیان مارا...... مجمع باز نے پھر پوچھا...... میں کون؟...... کٹے سر نے جواب دیا...... عامل...... تو کون؟ معمول...... مجمع باز ٹین کا ڈبہ لے کر لوگوں سے پیسے مانگنے لگا۔

حضرات اس مرے ہوئے شخص کی گردن صرف اس صورت میں جڑ سکتی ہے۔ اگر آپ یہ سورۃ یٰسین کی پرچی خرید لیں۔ مجمع میں کھڑے لوگوں نے دھڑا دھڑ سورۃ یٰسین کی پرچیاں خریدنی شروع کر دیں۔ احمد کبیر کو لگا جیسے جنوبی آج کل گلے جا بجا کاٹ رہے ہیں۔ یہ بھی ان میں سے ہے۔ لیکن سورۃ یٰسین کی پرچی خریدنے کے لیے اپنے تہبند کی ڈب میں بندھے ہوئے پیسوں پہ ہاتھ مارا اور یہ سوچ کر ہاتھ روک لیا ارے یہ تو مجمع باز کا پیسے

ہونے کا طریقہ ہے۔ لوگوں کی بھیڑ سے نکل کر ابھی آ ہی رہا تھا۔ بھاگ بھری کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ لگا اسے اپنی کبڈی کی جیت کے قصے سنا دے۔ آخری پوائنٹ میں تو میں ابھی وریام مچھو کو ہاتھ لگا کے بھاگا ہی تھا۔ اس نے مجھے انگڑی ڈال لی۔ میں نے بھی کوڈی کوڈی کا سانس نہیں توڑا اور یام مچھو کو اٹھا کے اپنی جیت کی حد کو پار کر لیا۔ ابھی کوڈی کا قصہ مکمل نہیں ہو پایا تھا کہ شور نے دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ دونوں بھاگ کر گئے تو دیکھا سڑک کے کنارے ایک زخمی عورت پڑی تھی۔ اس کا بیٹا رو رو کر فریاد کر رہا تھا...... اوئے میری ماں مر رہی ہے میری مدد کرو...... ظالم ٹرک والا میری ماں کو ٹکر مار کر بھاگ گیا......

احمد کبیر اور بھاگ بھری نے دیکھا ایک عورت سفید چادر میں ڈھپی لیٹی تھی۔ چادر ہٹا کے دیکھا تو یہ وہی عورت تھی جو میلے میں اسے اپنی ماں کی طرح لگی تھی۔

احمد کبیر اور بھاگ بھری سفید چادر ہٹا کے گھٹنوں تک لے گئے۔ بزرگ عورت سبز شلوار قمیض میں دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے ہوئے تھی۔ ایک ہاتھ میں چاندی کا کڑا اور دوسرا ہاتھ کڑے کو آدھا چھپا تا جیسے چاند ہو۔ دوسرے ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھی ستارے کی طرح چمک رہی تھی۔

سبز شلوار قمیض...... پہ چاند اور تارا...... گھٹنوں تک سفید چادر...... سبز اور سفید جھنڈا بن کے سامنے آیا ہو۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پاکستان کا جھنڈا انسان بن گیا ہو...... ماتھے سے خون بہہ رہا تھا اور تارے والے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی......

اس کا بیٹا پھوٹ پھوٹ کر فریاد کر رہا تھا۔ اوئے میری مدد کرو...... احمد کبیر نے تہبند کی ڈب میں بندھے ہوئے پیسوں پہ ہاتھ مارا...... بھاگ بھری کی طرف دیکھا...... اس نے ہاں میں سر ہلا دیا...... احمد کبیر نے جیت کے سارے پیسے نکال کے عورت کے بیٹے کو دے دیے۔

پیسے لیتے ہی اس کا بیٹا مجمع سے نکل کر غائب ہونے لگا...... احمد کبیر فوراً اس کے

پیچھے پہنچا...... اتنی دیر میں دوسرے لوگ چار پائی لے آئے تھے...... تا کہ زخمی عورت کو اس پہ لٹا دیں...... احمد کبیر نے لڑکے کی کھدر والی قمیض کا پہلو پکڑا...... اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا...... کوئی اپنی ماں کو بھی بیچ سکتا ہے۔ نہیں نہیں...... ڈرتے ڈرتے...... ہاتھ کے اشارے سے بہت کچھ کہنا چاہ رہا تھا...... شاید وہ جو کچھ سوچ رہا ہے وہ غلط ہو...... حیوان بھی اپنی ماں کا خیال کر لیتے ہیں اس کی زبان لفظ چھوڑنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ لکنت کی بندش میں اس کا ذہن بہت سے سوالوں سے گڈمڈ ہو رہا تھا۔ اس کے منہ سے بڑی مشکل سے صرف یہ نکل سکا...... او...... اوں۔ پک...... کوئی اور زور سے بولا تمہارے بھاگنے کا...... مطلب کیا...... لا الہ الا اللہ...... کی بلند آواز کے ساتھ لوگوں نے زخمی عورت کو چار پائی پہ ڈالا اور لے گئے......

☆☆☆

مریم کی سفید آنکھیں

''کیا میں عیسیٰ ہوں؟''

زینب کے پیٹ میں بچے نے ماں سے پوچھا۔''نہیں میرے چاند..........تو تو اپنی ماں کا دلارا ہے۔تو تو میرا چاند ہے۔دیکھ میرے چاند میں تیرے لیئے سویٹر بن رہی ہوں۔کہیں تجھے ٹھنڈی ہوا نہ لگ جائے۔''

''مگر ماں تجھے تو دکھائی نہیں دیتا؟تو سویٹر کیسے بن رہی ہے؟''

''تو کیا ہوا؟ میں تجھے تو دیکھ سکتی ہوں۔تم میری آنکھیں ہو۔تمہاری سانسیں میرے دل کی دھڑکن کے ساتھ چلتی ہیں۔ تم میری روح کا غلاف ہو..میں تو تیری آنکھوں سے سویٹر بن رہی ہوں۔''

زینب کے بیٹے نے مچلتے ہوئے کہا۔''نہیں مجھے نہیں چاہیے سویٹر............تم اپنے لیے قمیض بنا لو۔تمہاری ساری قمیض تو پھٹ گئی ہے................ پر یہ قمیض پھٹی کیسے؟..............ایک آدمی تھا جس نے تمہاری قمیض پھاڑی تھی یا اور لوگ بھی تھے؟اُن

ظالموں نے تمہیں مارا بھی تھا..............تم تو دیکھ بھی نہیں سکتی...........ایسے بھی ظالم ہیں اس دنیا میں؟ جو بے بس لاچار اور معذور سے اپنی جنسی ہوس کی تسکین کرتے ہیں۔"

"بس کر بس"........................زینب نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔جیسے وہ اپنے ضدی بیٹے کو چپ کروانے کی کوشش کر رہی ہو۔

زینب کا چہرہ جذبات سے عاری تھا اور بس آنسو تھے جو اپنا راستہ خود ڈھونڈ کر رخساروں سے ہوتے ہوئے........تھوڑی کے راستے گردن پر دانتوں سے کاٹے گڑھے میں ٹھہر جاتے تھے۔

"ماں.........تو دنیا کی سب سے خوبصورت ماں ہے........تو بہت خوبصورت ہے ماں اس لیے تو تمہارے ساتھ یہ ظلم ہوا ہے۔جب تم نہا کر، پاک صاف ہو کر سفید ساڑھی پہنتی ہو........تو بالکل مریم کی مورتی لگتی ہو۔جیسے سفید برف پر سفید مریم دھیرے دھیرے چل رہی ہو۔

وہ دیکھ ماں خدا....................دودھیا غبار کے چاند میں بیٹھے بادلوں کے پردے میں سے تمہیں دیکھ رہا ہے۔وہ دیکھ چھوٹے چھوٹے ستارے ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار........توڑ کر تمہارے طرف پھینک رہا ہے۔دیکھ وہ تمہیں اشارے بھی کر رہا ہے۔

مجھے ماں تھوڑی دیر کے لیے تاج محل کے گنبد سے باہر آنے دے۔میں تم سے اور خدا سے لکن چھپی کھیلوں گا۔میں بھی تین پہیوں والی بادلوں کی سائیکل چلا کر بھاگ جاؤں گا۔تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گا۔اور...........تم ستاروں کو ایک ٹیلا بنا کر اس کے پیچھے چھپ جانا۔

میں یہاں ہوں.............تمہارے پیٹ کے تالاب میں موم بتی سے چلنے والے جہاز میں بیٹھ کر میں پانی کے اندر طلسماتی محل میں چھپ جاؤں گا۔ماں اس تالاب میں مچھلیاں بھی ہیں......نیلی...سنہری.....چاندی جیسی مچھلیاں.................."

ایک دم زینب کا بیٹا خاموش ہو گیا.... اور کچھ سوچ کر رونے لگا۔ " ماں اب یہ کیا سلوک کریں گے تیرے ساتھ؟ کیا یہ انتظار کر رہے ہیں...... میرے اس دنیا میں آنے کے بعد تجھے پتھروں کے ساتھ مار مار کر مار دیں گے؟ ایک تو تجھے میرے اس دنیا میں آنے کی تکلیف اور اوپر سے تجھے پتھروں سے مر جانے کی تکلیف........ مجھے اندر ہی رہنے دے.......... مجھے مچھلیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ اگر اپنے پیٹ میں نہیں تو مچھلی کے پیٹ میں رہنے دے۔ پیغمبر بھی تو مچھلی کے پیٹ میں پناہ لیتے تھے۔ یہ پیٹ ہی تو ہے جس نے حضرت یونسؑ کو محفوظ کیا تھا۔ تیرے یا مچھلی کے پیٹ میں ظالموں سے بچا رہوں گا۔ دنیا کے پیٹ میں یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے، وہ تو مجھے قبر کے پیٹ میں اتار دیں گے۔

سمجھ نہیں آتی ماں؟ ظلم تو تجھ پہ ہوا اور جیل میں بھی تجھے ڈال دیا؟ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ اس لیے کہ تو اندھی ہے؟ تو دیکھ نہیں سکتی۔ میرے پاس تیری بے گناہی کا ثبوت نہیں ہے۔ ظالم کے ظلم کا ثبوت نہیں ہے تیرے پاس؟ تیرے پیٹ میں بڑھنے والا میں تیرے گناہ گار ہونے کا ثبوت ہوں۔ کسی کے ظلم کا گناہ کسی کو نظر نہیں آتا پر...............

تیرا بڑھا ہوا پیٹ نظر آتا ہے۔

ان کے پاس دوربین نہیں ہے جس سے کسی کے جرم کو دیکھ سکیں۔ کیا یہ مذہب دوربین ہے۔ جو دور کی چیزوں کو صاف دکھائی دینے میں مدد دیتی ہے؟ بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھائی دے۔ یہ وہ بڑا سا ڈبہ ہے جو بابا گلی میں اپنے کندھے پہ ڈال کر لاتا ہے اس ڈبے میں اچھی اچھی تصویریں گھماتا ہے اور جنت کے نظارے دکھاتا ہے۔ بارہ من کی دھوبن بھی دیکھو، پانی سے باہر جل پچھلی بھی دیکھو۔ ماں، ماں اس مچھلی کا سر خوبصورت عورت کا ہوتا ہے؟ اور ماں دھڑ مچھلی کا ہوتا ہے۔

پروں والا گھوڑا بھی دیکھو، ماں وہ ستاروں کے جھرمٹ میں آسمان میں اڑ رہا ہوتا ہے۔ کیا اسے پری گھوڑا کہتے ہیں؟

یہ مذہب کیا ہے؟ ماں............کیا یہ وہ ڈوری ہے جو لاٹو کے گرد لپیٹی ہوتی ہے؟ جب اسے کھینچتے ہیں تو لاٹو گھومنے لگتا ہے۔ کیا ہم سب لاٹو ہیں؟

ماں مجھے کھلونے دلوا دے مجھے مورتیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ مجھے یہ قانونی مجسمہ دلوا دے۔ یہ بالکل تیری طرح ہے۔ یہ اس کے ایک ہاتھ میں ترازو ہوتا ہے۔ وہ ترازو کہاں ہے؟ بس دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے۔ دیکھ ماں بالکل تیری طرح یہ تو دیکھ نہیں سکتی کیا یہ قانون کی دیوی اندھی ہے؟ نہیں ماں یہ اندھی تو نہیں یہ تو کسی کے ساتھ لکن چھپی کھیلنے کے لیے اس نے اپنی آنکھوں پہ پٹی باندھ لی ہے۔

چلو آؤ ماں اس سے لکن چھپی کھیلیں۔...............لک چھپ جانا...............

مکئی دا دانہ............راجے کی بیٹی آئی ہے۔ آ جا...کیا امی مذہب اور قانون لکن چھپی کھیلتے ہیں؟ یا یہ گھوڑا گھوڑا کھیلتے ہیں؟ مذہب گھوڑا بنتا ہے اور قانون اس کے اوپر بیٹھتا ہے۔ تکا تک جدھر باگ کھینچو وہ ادھر مڑ جاتا ہے۔

مجھے بھی گھوڑا چاہیے جس پہ بیٹھ کے میں آگے پیچھے ہل سکوں۔ مجھے اڑنے والا ہیلی کاپٹر دلوا دے ماں...............پر ماں آری والا ہیلی کاپٹر نہ ہو۔ اس سے مجھے ڈر لگتا ہے۔

پر ماں ان دکانوں پر مذہب کے بورڈ کیوں لگے ہیں؟ کیا یہاں مذہب بکتا ہے؟ یا کھلونے بیچنے کے لیے مذہب کا نام استعمال ہوتا ہے؟ کیا کھلونے بھی مذہبی ہوتے ہیں؟...............................نہیں ماں یہ کوئی کھیلنے کی چیز تھوڑی ہے!

مگر دکاندار فوجی کیوں ہیں، وہ دیکھو ماں..........اس دوکان پر ایک فوجی اپنے آپ کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی دائیں آنکھ بائیں آنکھ کو دیکھنے کی تگ و دو میں بالکل اندر کی طرف گھوم گئی ہے۔

وہ دیکھ...............وہ گڈی گڈا کیسے اچھے لگ رہے ہیں۔ میں بھی گڈی گڈے کا بیاہ کروں گا.....خوب کھانے پکائیں گے.....بلی دیگ پکائے گی۔ چوہا منیٹ لگا کر

میز اور کرسیاں بچھائے گا۔ بندر خوب ناچے گا......اچھل اچھل کر........................ پر
گڈی گڈے کا بیاہ مولوی صاحب کروائیں گے؟................... پر ماں گڈی گڈا بیاہ
کیوں کرتے ہیں؟.............. تا کہ ان کے بچے ہوں........ اگر بیاہ کے بغیر بچے
ہو جائیں تو اس کی سزا الگ ہے؟ گڈی کو پتھروں سے مار دیتے ہیں؟

اور اگر بیاہ کے بعد گڈا زبردستی گڈی کی مرضی کے بغیر اس کا پیٹ بڑا کر دے تو
اس کی کوئی سزا نہیں..................

پر ماں تو بھی تو گڑیا کی طرح ہے......... جس نے تم سے زیادتی کی اس کو تو چھوڑ
دیا کیونکہ اس کو تو کسی نے دیکھا نہیں..... مگر تیرا بڑھا ہوا پیٹ دیکھ سکتے ہیں........... اس لیے
تو قصوروار ہے................................"

زینب کے بیٹے نے غصے سے، زور سے لات ماری اور تکلیف سے زینب کی چیخ
نکل گئی۔ زینب نے پیار سے پیٹ پر ہاتھ پھیرا...." غصہ نہ کر تیرے غصے کی بھی مجھے ہی
تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔" زینب کے پیٹ کا درد بڑھنے لگا... جیل کی قیدی دائی کا ہاتھ جب
بھی مالش کے لیے پیٹ پر پڑتا تو زینب کا بیٹا چیخ اٹھتا................ مجھے اس دنیا میں نہیں
آنا۔ مجھے اس دنیا میں نہیں آنا۔ مجھے اپنے سے الگ نہ کر ماں.... یہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔

زینب کے پیٹ نے بھی چیخ پکار ان سنی کرتے ہوئے اسے دھکیلنا شروع کر دیا۔
جب جسم برداشت کی حد سے بڑھ گیا تو بچے کو اگل دیا۔ زینب خوشی سے پھولی نہ سمائی جا رہی
تھی۔ خوشی اور غمی کے آنسو جاری تھے۔

"ہائے تو میری آنکھ بنے گا۔ تو مجھے راستہ دکھائے گا۔ تو تو میری اندھیری کائنات
کا روشن چاند ہے۔"............................ اتنے میں مسجد کے اندھے موذن...........
بچے کے کان میں اذان دینے کے لیے تشریف لے آئے۔ جیسے موذن اپنا منہ بچے کے
کان کے قریب لاتا۔ بچہ اپنے کان بند کر لیتا۔ زور سے رونے لگا۔

واں آؤں..........واں.......................

جیسے کہہ رہا ہو۔ ایک تو تم اندھے ہو پھر اذان دیتے وقت تم اپنے کانوں کو اپنی انگلیوں سے بند کر لیتے ہو۔ تمہیں تو خود اپنی اذان سنائی نہیں دیتی۔ تمہیں تو اذان کی سمجھ ہی نہیں...........تم سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ تبھی تو اپنے کان بند کر لیتے ہو۔

''مت میرے کان میں اذان دو''

آہستہ آہستہ بچے کے رونے کی آواز گم ہو گئی۔ سدھ بدھ ہو کے آسمان کی طرف دیکھنے لگا.....جیسے خدا سے کہہ رہا ہو......

تو خود آ کے میرے کان میں اذان دے۔

جیل کی کوٹھری کے باہر فوجی جرنیل قاضی الوقت کے مشورے کے بعد جیل کے اہلکاروں کو حکم دے رہا تھا، ''ایک چھوٹی سی سولی بناؤ...ہمیں مثال قائم کرنی ہے اور دنیا کو بتانا ہے کہ حرامی بچے ناقابل معافی ہیں ان کا ناپاک بدن اس پاک سرزمین کے لیے ذلت اور بدنامی کا موجب ہے۔''

بڑھئی چھوٹے سے چبوترے پر لکڑیوں کے بالوں کی چار فٹ کی سولی میں کیل ٹھونک رہا تھا۔ دائیں طرف کھڑا ہوا اندھا موذن ہاتھ آسمان کی طرف کر کے دعا مانگ رہا تھا۔

''میرے پروردگار اس معصوم کے گناہ معاف فرما...........اسے اپنی رحمت سے سرشار کر..............اس پہ اپنی شفقت اور محبت کا سایہ ڈال......''

اور ایک لمبا ٹھنڈا سانس لینے کے بعد اپنے دونوں ہاتھ منہ پر پھیرے اور کہا، ''ہمارا کیا ہے ہم تو اندھے موذن ہیں اگر کوئی ہماری انگلی پکڑے.....مریم کی مورتی کے سامنے لے جائے گا تو ہم اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں گے۔''

☆☆☆

برہنہ شہد کا بھنور

ٹلو نے باورچی خانے کی الماری میں شان مصالحوں کے ڈبوں کے ساتھ پڑی ہوئی شہد کی بوتل کو اٹھایا۔ تھوڑا سا شہد اپنی ہتھیلی پر انڈیلا، ہتھیلی کو اپنی ٹھوڑی کی سیدھ میں رکھ کر ابھی غور سے دیکھ ہی رہا تھا کہ جیسے ٹرانسمیٹر نے شہد کی آمد کی اطلاع نلکے کی ٹونٹی پر بیٹھی ہوئی مکھی کو دے دی۔ مکھی نے سیسنا جہاز میں بیٹھے ہوئے پائلٹ کی طرح کاک پٹ کے سارے بٹنوں کی جانچ پڑتال کی۔ پہلے دائیں طرف دیکھا، پھر بائیں طرف۔ مکھی بھی پہلے دائیں طرف مڑی اور پھر بائیں طرف اپنے جہاز کو چوتھے گیئر میں ڈال کر اڑانا شروع کر دیا۔

ٹلو ابھی شہد کا مشاہدہ کر ہی رہا تھا، اور اس سوچ میں تھا کہ زبان کے ایک ہی لپیٹے سے شہد کے قطرے کو اپنے گلے میں اتار دوں یا دو باریوں میں ہتھیلی کے فرش کو پونچھ ڈالوں۔ اسی اثنا میں مکھی نے اپنے جہاز کو غوطہ دیا اور ہتھیلی کے رن وے کو ٹارگٹ کر کے لینڈنگ کا گیئر دبایا۔ اس سے پہلے کہ مکھی عین ٹارگٹ پہ لینڈ کرتی ٹلو کی زبان نے ایک ہی لپیٹے میں شہد کو ہتھیلی سے پونچھ ڈالا۔ اور ہتھیلی کو یوں بند کیا جیسے پلاسٹک کا بنا ہوا رن وے غالیچہ

کی طرح گولائی میں سٹے ہو گیا ہو۔ مکھی نے بجائے ہتھیلی پر لینڈ کرنے کے سیدھی مٹھی کی چھنگلی انگلی پر اپنے ٹائروں کو جمایا اور جہاز کو پارکنگ کے گیئر میں ڈالا۔ کھڑے ہوئے انجن کی بھوں بھوں یا نشانہ چوک جانے سے غصے کی گھوں گھوں کا شور اور بھی تیز ہو گیا۔ نلو کا بازو ابھی نوے ڈگری سے سیدھا ہونے کو تھا کہ مکھی کے دکھی راگ نے نلو کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے مکھی کو دیکھ کر منہ کا نچلا جبڑا اجام کی مشین کی طرح دائیں اور بائیں ہلا اور دونوں آنکھوں نے چھنگلی انگلی کے جوڑ پہ نشانہ باندھا۔۔۔ ہوں کیا پدی، کیا پدی کا شوربہ۔ نلو بڑبڑایا اور دوسرے ہاتھ کو چھکا بنا چھنگلی انگلی کی طرف لہرا ہی رہا تھا کہ مکھی کے ریڈار نے آنے والے خطرے کی اطلاع کر دی۔

مکھی ہاتھ کے چھکے کو دھوکہ دیتی ہوئی مخالف سمت میں چوتھے گیئر میں ڈاج دے گئی۔

نلو کو شرارت سوجھی۔ اس نے شہد کی بوتل کو اٹھایا اور باہر گلی میں آ گیا اور کافی سارا شہد باہر والی دونوں ٹیڑھی انگلیوں سے نکال کر گھر کے باہر والی دروازے کی چوکھٹ سے دو گز کے فاصلے پر دیوار پر مل دیا۔ بس پھر کیا تھا۔۔۔ طاقت اور توانائی سے بھرپور حکیم حاجی اللہ وسایا کے اس اشتہار کی طرح جس میں مردانہ کمزوریوں کا علاج اور زنانہ پوشیدہ امراض کے راز کا ذکر، مکھیوں کے اس گروہ نے جو بالکل دروازے کے ساتھ نالی کے کنارے پہ پڑے ہوئے بچے کے فضلے پر بیٹھے پڑھ لیا ہو۔ جو پہلے ہی فضلے کو کھانے سے بھوک ہڑتال کے فیصلے پر تقاریر کر رہے تھے۔ گروہ کا ایک لیڈر بڑے جوش و خروش سے اپنی دلیلیں دے رہا تھا کہ ساری پروٹین تو بچے کا جسم ہضم کر جاتا ہے اور بے کار گودا ہمارے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ فوراً مکھیوں کے باغی ٹولے نے دیوار پہ لگے شہد کے خزانے کی طرف اپنا رخ کیا۔ جیسے جرنلسٹ کو گورنر ہاؤس میں کھانے کی اطلاع ملی ہو۔ پریس کانفرنس ہو نہ ہو لذت اور توانائی سے بھرپور کھانا ضرور ملے گا۔

سب سے بڑی مکھی نے اپنے اگلے دونوں ہاتھ ہوا میں ایسے ملے اور زور سے دونوں پچھلے پیروں پر کھڑے ہوکر اطلاع دی جیسے مغرب کے وقت مولوی خدا کی یاد کم اور روزہ افطار کرنے کے جوش کو پوری طرح استعمال کرتا ہے اور خود پہلے افطار کیا اور بعد میں اپنے گروہ کو نعمت سے نوازا کہ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ جب بھی کھاؤ خداوند کریم کی نعمتوں کو ضرور یاد کرو۔ بس ٹولے کی سب مکھیاں شہد کے گرد جمع ہونے لگیں اور خراماں خراماں شہد کے قطرے کی طرف بڑھنے لگیں۔ سمجھدار مکھیوں نے پہلے اردگرد کا جائزہ لیا۔ اپنے سر کو دونوں طرف موڑ کے دائیں بائیں پلٹ کر خطرے کا اندازہ لگایا کہیں دشمن پیچھے سے وار نہ کر دے۔ اڑ کے پیچھے کی پیٹھ کی طرف بیٹھ کر اپنے گردونواح کا جائزہ لیا۔ اور بہت سی بے صبری چھوٹی مکھیوں نے سیدھا شہد کے بڑے قطرے پر دھاوا بول دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی ٹانگیں شہد کی دلدل میں پھنس کر رہ گئیں۔ کنارے پر کھڑی باتمیز مکھیوں نے ان کی پروا کیے بغیر اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ کو پونچھا، آپس میں ملایا، اپنے سینے پہ ایسے لگایا جیسے گلے کے گرد نپ کن باندھ رہی ہوں۔ بھوک سے مری مکھیاں بھی شہد کے مقناطیس سے چپک کر رہ گئیں۔ بس ایک اودھم برپا تھا، اندر پھنسی مکھیوں کو اپنی جان کے لالے تھے۔ باہر والی مکھیوں کی نصیحتیں، کیوں اتنا لالچ کیا تھا۔ لیڈر مکھی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تقریر پھر شروع کر دی۔ یہ سب امریکا کی سازش ہے شہد میں مقناطیس کی ملاوٹ ہو رہی ہے۔ بس ایک ہنگامہ برپا تھا۔

دروازے کی چوکھٹ اور اینٹوں کی دیوار کے درمیان فاصلے میں چھپکلی رت جگے سے تھک کر دن میں خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی کہ مکھیوں کی گھوں گھوں اور بھوں بھوں نے اس کی نیند میں خلل ڈال دیا۔ اور انگڑائی لیتے ہوئے بادل نخواستہ سر کو پیچھے موڑنے کی کوشش کی تو مڑ نہ سکی اور خود سے کہا ہوں تو میں سانپ کی بہن پر مڑنے کے لیے مجھے مور کی طرح پورا چکر کاٹنا پڑتا ہے۔ لہٰذا دراڑ سے باہر نکل کر دیوار پر اپنے منہ کو پورا کھول

کراہ سی لی۔ زبان کو پوری باہر نکال کر گھمایا، بڑی شان بے نیازی کے ساتھ اپنا اگلا دھڑ بائیں سمت کیا اور بائیں اور دائیں ہاتھ کو آگے بڑھا کر موڑا۔ پونچھ اور دونوں لاتیں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ دوبارہ بائیں طرف مڑیں تو ہم اپنے آپ کو آگے بڑھائیں۔ بالکل پنجاب کے جاگیردار کی طرح وہ جس سمت میں بھی مڑے اس کا کلاشنکوف بردار باڈی گارڈ اس کے جسم کا تعاقب کر سکے۔ جب چھپکلی تھوڑی سی آگے بڑھی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ارے واہ اتنی ساری مکھیاں مجھے تو رات کا انتظار ہی نہیں کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی مچھروں اور بھنوروں کو بھی بلب کے گرد پکڑنے کی کوشش میں کئی دفعہ منہ جلا بیٹھی ہوں۔ چلو رات کا کھانا ابھی تناول فرمالیں۔

فوراً سانپ کی بہن میں چیتے کی پھرتی آ گئی اور چوکھٹ سے شہد کا فاصلہ اتنی تیزی سے طے کیا کہ جیسے فیصل آباد جانے والی ویگن نیو خان کی بس سے پہلے مانسہرہ سے ساری سواریاں سمیٹ رہی ہو۔ بس سپولے کی ہمشیرہ زبان نکالے بغیر اپنے پڑدادا مگر مچھ کی طرح پورا منہ کھولا اور پانچ مکھیوں کا برنچ 99 روپے والی سیل کی طرح کر لیا۔ لیکن بریک بالکل سوری کی طرح شہد سے کچھ فاصلے پر جا لگی جب آدھے دائرے کا سرکل لگا کر واپس مڑی تو سب مکھیاں وہاں سے جا چکی تھیں۔ لیکن شہد میں پھنسی مکھیاں بالکل کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے، کبوتر کی طرح خاموش تھیں جیسے بلی نے انہیں بالکل نہیں دیکھا۔ چھپکلی نے پھنسی مکھیوں کو دیکھ کر زبان سے ہونٹوں کو صاف کیا۔ چلو ناشتہ تو ہو گیا سہ پہر کی چائے کے ساتھ شیزان کی لیمن ٹارٹ ہی سہی اور بالکل شیر کی طرح شہد میں پھنسی مکھیوں پر جھپٹی۔ بدقسمتی سے اگلے پاؤں تو شہد کے کیچڑ میں پھنسے اور پچھلا دھڑ بے قابو کمر کے بل اکی پہلوان کی طرح زمین پر چت جیسے انوکی نے اس کا بازو مروڑا ہو۔ بالکل سامنے دودھ کی دکان کے باہر پڑے ہوئے بنچ کے نیچے بلی سارے تماشے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے بھی طیش آ گیا۔ ارے تو بے تو ذات کی چھپکلی اور جھپٹے تو شہد کے بھرے شہتیروں سے ذاتی ہے۔ اپنی

اوقات تو پہچان۔ آؤ ہم سے دوستی کرلو، گر سکھادیں گے بادشاہی کے تمہیں۔ دیکھ میں نے اپنے بھانجے کو بادشاہت کے گر سکھادیے۔ درخت پر چڑھنے کا گر تو میں نے شیر بھانجے کو نہیں سکھایا۔ لیکن تمہیں دیوار پر چڑھنے کا گر سکھادوں گی۔ پرے جا پرے تو نخیری کوٹ کر لی۔ تیری یہ مجال ہمارے محلے میں ہمیں ہی کو میاؤں۔ پہلے کھڑی ہو کے غرائی پھر دو قدم آگے بڑھ کے اپنی پیٹھ کا کُب نکالا۔ گلی کبڑے عاشق کی طرح چلنے۔ پھر دوبارہ آگے پیچھے جسم کو متوازن کر کے ایک ہی جست میں چھپکلی کے اوپر۔ بائیں ہاتھ چھپکلی کی پونچھ پر اور بائیں ہاتھ سے اسے بھیر مارنے لگی۔ چل آ کبڈی کبڈی کھیلیں۔ ہوں تو تو شہر میں پلی بڑھی ہے۔ تجھے کیا پتا کبڈی کا۔ اچھا ہاکی یا کرکٹ کھیلتے ہیں۔ میں بھی بھول گئی میں تو تم سے باکسنگ کھیل رہی ہوں۔ چھپکلی کو جب بلی کے دو پنچ پڑے تو چھپکلی کو سب کھانے پینے کی ٹی پارٹی بھول کر ہوش آیا اور سر جھٹک کے کہا رے باپ رے میں خود دعوت شیراز میں مرغ مسلم بننے گئی ہوں۔ فٹ سے اپنے پاؤں سر پر رکھے اور چھوے کی طرح دم دبا کر بھاگی۔ لیکن بلی نے جو جنگل کے ظل سبحانی شیر کی خالہ، صاحب عالم چیتے کی پھوپھی جس کا پورا خاندان جنگل کی سلطنت کا کرتا دھرتا ہو، ذرا لہک کر گنگنانا شروع کیا۔

چھپکلی بی جاؤ گی کہاں دل توڑ کے۔ بلی نے زور سے ایک جست لگائی۔ ابھی بلی ہوا میں تھی کہ راستے میں پڑے ہوئے حلوائی کے پتیلے کا چمچہ باہر نکلا ہوا تھا۔ بس چمچے کا پتیلے میں گرنا ایسا تھا جیسے پرائمری سکول کے چپڑاسی نے آدھی چھٹی کے لیے ٹلی کھڑکھڑا دی۔ حلوائی کے ساتھ والی قصائی کی دکان کے باہر بیٹھا خارشی کتا کئی دنوں سے بھوکا اس انتظار میں بیٹھا تھا۔ شاید قصائی جواب یہ بکرا صاف کر رہا ہے اس کے چھچھڑے میری طرف پھینک دے گا۔ لیکن بدقسمتی سے مہنگائی نے لوگوں کو مٹن کڑاہی کے بجائے چھچھڑا کڑاہی کی عادت ڈال دی تھی۔ لاغری اور توانائی کی کمی کی وجہ سے کہیں اور ذریعہ معاش ڈھونڈنے کی ہمت تو تھی نہیں۔ لیکن کسی چیز کو بھاگتے دیکھ کر اس کا پیچھا نہ کرنا اس کی شان کتائی کے خلاف

تھا۔ جھٹ سے بلی کے پیچھے ہولیا۔ جب بلی نے کتے کو پیچھے آتا دیکھا تو کرکٹ کا میچ بھول کر جان بچانے کے لیے رک گئی سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی۔ بلی رکی تو کتا بھی رک گیا۔ بلی نے کتے کو کسی اور دھیان میں لگانے کی کوشش کی۔ بڑی سریلی آواز میں منہ بنا کر مہدی حسن کی آواز میں گانا شروع کر دیا وہ تیرا آنا بھیگی راتوں میں چپکے چپکے سے۔ خارشی کتے کو بھی اپنی محبوبہ بری طرح یاد آئی جو اسے چھوڑ کر چوہدری کے بولی کتے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس سے پہلے جناب والی عاشق کتے کو بے وفا محبوبہ کا دیا ہوا زخم اس دنیا میں واپس لاتا۔ بلی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس زور سے پھلانگی کہ دیوار سے پاؤں پھسل گیا۔ سیدھی دودھ کے بڑے کڑاہ میں یوں گری جیسے چائنیز اولمپکس میں تیراکی کے مقابلے میں کورین تیراک نے سمرسالٹ لگائی ہو۔ بلی تو کڑاہ سے نکل کر بھاگ گئی۔ لیکن حلوائی بھیگی بلی بنا چھوٹی بچی کو دودھ نہ دینے کے بہانے کرنے لگا۔ بیٹی جاؤ دودھ خراب ہے۔ بچی واپس گھر جا ہی رہی تھی کہ گلی کی نکڑ پہ مڑ کے دیکھا تو حلوائی کڑاہ کے نیچے چولہے میں لکڑیاں ڈال رہا تھا۔ آگ کو تیز کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ کے بڑبڑاتے ہوئے میں نے تھوڑا ابلی کو بلایا تھا۔ آسمان سے اللہ نے پھینکی ہے۔ ویسے بھی جراثیم تو کب کے آگ سے جل مرے ہوں گے۔

حلوائی نے دودھ بیچنا شروع کر دیا۔ چھوٹی بچی نے بلی والی ساری کہانی گھر آ کے بتا دی۔ بس پھر کیا تھا سارے محلے والے ویسے بھی دودھ کی جگہ پتلی لسی پی پی کے تنگ آئے ہوئے تھے۔ پورے محلے نے مل کے حلوائی کی دکان کو آگ لگا دی۔

جلی ہوئی دکان کے سامنے نلو بیٹھا شہد کی بوتل کو اپنی ہتھیلی پہ انڈیل کر کہہ رہا تھا۔ میں کوئی شیطان تھوڑا ہی ہوں۔ میں نے تو صرف شہد کو بوتل سے باہر نکالا ہے۔

☆☆☆

نرم کوہسار اور بہتی چاندنی

"آج میں چالیس سال کا ہو گیا ہوں۔"

محسن نے سالگرہ کے کیک کے سامنے اکیلے بیٹھے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

باورچی خانے کی بتیاں بند تھیں۔ کیک پر کوئی موم بتی بھی نہیں تھی جس کی روشنی میں وہ کیک کاٹنے کے لیے چھری ڈھونڈ سکتا۔

ایک دم اس کے دماغ کی موم بتی جل اٹھی اور وہ فوراً ایک طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے باورچی خانے کو روشن کیا۔ ایک چھوٹی سی موم بتی ڈھونڈ کر کیک پر لگائی۔ میں چالیس سال کا ہو گیا ہوں تو کیا ہوا۔ میں اس درمیانی عمر کے المیے سے نکل کر آج چالیس سال نہیں بلکہ زندگی کو پہلے سے شروع کروں گا۔ فوراً اس کی اس ذہنی کیفیت کا ترجمہ انگریزی کے ان الفاظ نے کر دیا۔

"MID LIFE CRISIS" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اور اس بحران سے نپٹنے کے لیے اس نے ایک فیصلہ کیا۔

جب میں پیدا ہوا تھا تو مجھے اپنی پرورش کے لیے کسی اور کی ضرورت تھی۔ اس

ضرورت نے میری نشوونما پر خاصے اثرات ڈالے ہیں، ایک خاطر خواہ کردار ادا کیا ہے میری شخصیت کے مکمل ہونے میں۔ اور جو ضروری چیزیں نہیں مل سکیں ان کو حاصل کرنے کی اب مجھ میں سکت ہے اور انہیں میں خود پوری کروں گا۔

اور ایک انجانی محرومی کا احساس اسے پریشان کرنے لگا اور جن چیزوں سے محسن محروم رہا ہے ان کو اپنا لینا ہی شاید اس کے بحران کا مداوا ہے۔ اس کی شخصیت کی پختگی کا دارومدار ان چیزوں کا حاصل ہے۔ ذہن کی اس گتھی کو سلجھانے کے لیے اسے خاص سمت کا اشارہ ملا اور انہی محرومیوں کی تلاش ہی اس کی نفسیاتی پروٹین کا حصول ہے۔ اُس نے انہیں پانے کا تجسس اور اپنی کیفیت کا اندازہ لگانے کا فیصلہ بھی خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اور اس نے اپنا ہاتھ چائے کی کیتلی کی طرف بڑھایا۔ مجھے کسی ماہر نفسیات یا سکائٹرسٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ اور چولہے کی آگ کا بٹن گھمایا۔ چائے کی پتی کے دو چمچے ڈالے اور جب چائے کا پانی ابلنے لگا تو پانی کے ابال نے ایک اور خیال کو ابالا دیا۔

کیوں نہ لارڈز ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پی جائے اور مال روڈ کا نظارہ کیا جائے۔ وہاں پہنچا تو خوش قسمتی سے کھڑکی والی ٹیبل بھی مل گئی۔ باہر نظر دوڑائی تو جیسے آتی جاتی گاڑیاں اپنی جگمگاتی بتیوں سے مسکرا کر سالگرہ کی مبارک باد دے رہی ہوں۔ لیکن ٹریفک لائٹ پر ایک کار سرخ بتی کے رکنے کے اشارے کی پروا کیے بغیر گزر گئی۔ اس کار نے شاید اسے یہ احساس دلایا کہ تم ابھی بچے ہو۔

محسن نے فوراً بیرے کو اشارے سے بلایا۔ اور ایک سیٹ چائے کا آرڈر دیا۔ بیرے نے فوراً سپرٹ چائے کے ساتھ رنگ برنگی پیسٹریوں کا ٹرے بھی رکھ دیا۔ محسن نے چائے کی پیالی میں ایک چمچ چینی کا ڈالا پھر کیتلی میں چمچے سے رنگ نکھارنے کے لیے قہوہ کو ہلایا۔ اور پیالی میں قہوہ کو انڈیلا۔ پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ عمدہ برانڈ کا فلیور دے رہی تھی۔ جب محسن نے دودھ دانی کو اٹھایا تو اُس پر اضطراب کی ایک کیفیت طاری ہوئی۔ دودھ دانی والا

ہاتھ کانپنے لگا اور وہ دودھ چائے کی پیالی میں نہ انڈیل سکا۔ اور چائے پیے بغیر ریسٹورنٹ سے اٹھ کر گھر واپس آ گیا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا۔ بہر حال وہ روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہو گیا۔

کچھ دنوں کے بعد شہر سے باہر ایک چھوٹے سے میلے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ موت کے کنویں میں گول بھاگتے ہوئے موٹر سائیکل کا تماشہ دیکھنے کے بعد جب محسن چھوٹے سے چڑیا گھر کے قریب پہنچا اور شیر، گیدڑ، بندر کی آویزاں تصویروں نے اس کی توجہ چھرے والی بندوق سے غبارے پھاڑنے والے بورڈ کی طرف مبذول کی۔ محسن کا جی چاہا کہ وہ بھی غبارے پھاڑے۔ گتے کے ایک بورڈ پر بندھے غبارے اور نیچے شیشوں کے چھوٹے بٹن لگے تھے۔ ایک غبارہ پھاڑنے سے اگلی باری فری ملتی تھی۔ اور اگر شیشے کے بٹن کو چھرے والی بندوق سے اڑا لے تو بیس روپے کا انعام۔ محسن نے پٹھان خان صاحب سے بندوق لے کر کھیل شروع کیا اور بالکل ناکام رہا۔ ایک دفعہ دو دفعہ بلکہ پچیس دفعہ نشانہ باندھا۔ لیکن ایک بھی غبارہ نہیں پھاڑ سکا۔ بلکہ شرمندہ ہو کر خان صاحب سے بحث لگانے لگا کہ تمہاری بندوق کی نالی ٹیڑھی ہے۔ چند قدم آگے بڑھا تو ایک چھوٹے لڑکے نے اسی بندوق سے شیشے والا بٹن توڑ دیا۔ پھر ایک اضطراب کی کیفیت طاری ہوئی۔ گتے پر بندھے ہوئے غباروں میں ایک مقناطیس جیسی کشش نے محسن کے ہاتھوں کو غباروں کو دبانے کے لیے مجبور کیا۔ کیونکہ وہ اپنی ناکامی سے شرمندہ تھا۔ اس لیے وہاں سے چلا آیا۔ لیکن وہاں اسے ایک غبارے والا مل گیا۔ اس نے دو بڑے گلابی رنگ کے غبارے خرید لیے کمرے میں گھسا تو غباروں کے دھاگے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ اور وہ چھت سے جا لگے۔ کرسی پر کھڑے ہو کے غباروں کو تھامنے کی کوشش کی وہ ہاتھ میں نہیں سمائے۔ وہ ذرا سخت بھی تھے۔

محسن نے دونوں غباروں کو ہینگر پہ لٹکے کوٹ کی سامنے کی دونوں جیبوں پر باندھ دیا۔ اور گھر کے کاموں میں مشغول ہو کر غباروں کو بالکل بھول گیا۔ صبح دفتر جانے سے پہلے

کوٹ کے سامنے بندھے دونوں غباروں کو دیکھا تو ان میں سے تھوڑی سی ہوا نکل چکی تھی۔ اور گولائی بھی کم ہو کے لمبائی کی سمت میں بڑھ گئی تھی۔ چھو کے محسوس کیا تو خاصے نرم ہو گئے تھے۔

دونوں ہاتھوں میں گداز سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ دفتر جانے کی جلدی تھی اس لیے غباروں سے توجہ ہٹا کر تیار ہو کر دفتر چلا گیا۔

لیکن دفتر میں تمام دن اس گداز کو خیالوں میں محسوس کرتا رہا۔ دفتر کا وقت ختم ہوتے ہی فوراً گھر پہنچا اور کوٹ کے سامنے بندھے غباروں کو دیکھا تو ہوا اور بھی نکل چکی تھی۔ ہوا میں اوپر اڑنے کے بجائے نیچے کی طرف لٹک گئے تھے اور گولائی میں اور بھی کمی آ چکی تھی۔ ایک طرف تو دھاگہ بندھا تھا اور دوسری طرف بچے کی چوسنی کا نپل بن گیا تھا۔

محسن سے بالکل نہ رہا گیا۔ فوراً دونوں ہاتھوں سے غباروں کو دبایا تو وہ خاصے نرم محسوس ہوئے۔ اس نے بے بس ہو کر غبارے کی چوسنی نما نپل کو منہ میں ڈال لیا۔ ایک انرجی نے اس کی جسم کو چارج کرنا شروع کر دیا۔ پورے جسم میں بجلی کی لہری دوڑ گئی۔ بے ہوشی میں اتنے زور سے جھنجھوڑا کہ دونوں غبارے پٹاخ کی آواز سے پھٹ گئے۔ محسن شرمندہ ہو کر باورچی خانے میں چلا گیا۔ اور چائے کا پانی کیتلی میں گرم ہونے کے لیے رکھ دیا۔ اور چائے کو پیالی میں چھان کر جب پھر دودھ ڈالنے لگا تو وہی کیفیت پھر طاری ہوئی۔ اس کا ہاتھ کانپنے لگا۔ اور وہ دودھ کو پیالی میں نہ انڈیل سکا۔ چائے کو وہیں چھوڑ کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اس سے یہ گتھی سلجھ نہیں رہی تھی۔

ہر ہفتے کے اختتام پر چھٹی والے دن محسن اپنی پھوپھی کو ملنے جاتا۔ پھوپھی کو وہ اپنی ماں سمجھتا تھا کیونکہ پھوپھی نے ہی اسے ماں بن کر پالا تھا۔ جب محسن پیدا ہوا تھا تو ماں باپ کی ناچاقی کی وجہ سے دونوں میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ محسن صرف دو ماہ کا تھا کہ اس کے باپ نے محسن کو اپنی بہن کی گود میں ڈال دیا تھا۔ لیکن اس کی پرورش میں کوئی کمی نہیں آئی۔

اچھی تعلیم، صاف ستھرا ماحول زندگی کی ہر آسائش محسن کے والد نے اسے مہیا کی۔ لیکن والدہ بیرون ملک چلی گئی اور کسی اور سے شادی رچالی۔ محسن نے کبھی اپنی ماں کو دیکھا تک نہیں تھا۔ لیکن کبھی کبھی اسے اپنی بیالوجیکل ماں کی محرومی کا احساس ضرور ہوتا۔

لیکن اب یہ خیال اس کے لیے خاصا حوصلہ افزا تھا۔ اب وہ چالیس سال کا ہو گیا ہے۔ اب اس کی شریانوں میں موروثی خون کے ذروں کی جگہ اس کے اپنے جسم کی مشین کے بنائے ہوئے ذروں نے لے لی ہے۔ اب وہ اپنے جسم کی جینیک انجینئرنگ کا خود آرکیٹیکٹ ہے۔ اب اس کی شخصیت اس کے اپنے عملوں کی مرہون منت ہے۔ یہ خیال اس کے جسم کی انرجی کو ایک سپارک دیتا۔

اس کے دماغ کے بند شریانوں میں خون کی آمدورفت کی رفتار کا گراف اونچائی کی سیڑھیاں پھلانگنے لگا۔

پھوپھی کے گھر کی سیڑھیاں پھلانگ کر جب گھر پہنچا تو پھوپھی جان نماز پڑھنے میں مصروف تھیں۔ نوکرانی نے چائے کے لیے پوچھا تو محسن نے چائے پینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ دودھ کے گلاس کو منہ تک لانے کا خوف ابھی دل سے نکلا نہیں تھا۔ صرف ٹھنڈا پانی لانے کا کہا۔

اسی اثنا میں نوکرانی کے نومولود بچے کے رونے کی آواز آئی۔ محسن نے نوکرانی سے کہا تم بچے کو دیکھو میں خود ہی فرج سے پانی لے لوں گا۔

نوکرانی بچے کی طرف بڑھی۔ محسن فرج کی طرف بڑھا۔ فرج سے پانی کی بوتل ہونٹوں سے لگائی تو اس کی نظر نوکرانی پر پڑی۔ جو اپنی قمیض اٹھا کر چھاتی کو بچے کے منہ میں دے رہی تھی۔ محسن ایک لمحے کے لیے وہیں منجمد ہو گیا۔ جیسے بچہ زندگی کو اپنے ہونٹوں سے چوس رہا ہو۔ بند آنکھوں سے دونوں لاتوں کے ساتھ سائیکل چلاتا۔ اس کی زندگی کی اڑان میں اس کی مدد کر رہے ہوں۔ محسن کو یہ احساس اتنی بری طرح جھنجھوڑنے لگا کہ اس نے اپنی

ماں کا دودھ نہیں پیا تھا۔

اتنی دیر میں پھوپھی نماز سے فارغ ہو چکی تھیں۔ حال احوال اور پیار محبت کی باتوں کے درمیان جب اس کی نظر نوکرانی پر پڑی تو محسن کی نظریں منجمد ہو گئیں۔ جیسے وہ اجنتا اورا کی غار میں تراشی ہوئی کوئی دیوی ہو۔ وہ دیوی جیسے اس کی ماں ہو۔ اس کی چھاتیاں جیسے کہ ماں کی چھاتیاں ہوں۔ نوکرانی کا بچہ وہ خود ہو۔

پھوپھی نے فوراً محسن کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔ جنداں ہماری نئی نوکرانی ہے۔ اس کا بچہ ایک مہینے کا ہے اور بیچاری کو کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے میں اس کا بہت خیال رکھتی ہوں۔

شام گھر آیا تو تمام رات انہی سوچوں میں گم رہا اور ماں کا دودھ پینے کی محرومی۔ چالیس سال کی عمر میں ایک خواہش بن کر ابھری۔ اور دودھ پینے کی خواہش آہستہ آہستہ جنونی کیفیت اختیار کرنے لگی۔ اور یوں لگنے لگا کہ آدھی عمر کے بحران کا حل اسی میں ہے۔ یہی وہ الجھا ہوا راستہ ہے جو کوہ قاف کی چوٹی پر بند میرے سکون کے طوطے تک جاتا ہے۔ اسی طوطے میں میرے سکون کی جان ہے۔

پس سکون کے طوطے کو حاصل کرنے کے لیے ہر روز شام کو دفتر سے سیدھا پھوپھی کے ہاں چلا جاتا اور شام کا کھانا وہیں کھاتا۔ اسی بہانے نوکرانی سے راہ و رسم بڑھانے شروع کر دیے۔ ہر روز اس کے لیے اور بچے کے لیے تحائف لے جاتا۔ جنداں بھی محسن سے بہت خوش تھی۔

آج محسن کو پتا تھا کہ پھوپھی جان رشتے داروں سے ملنے جائیں گی۔ محسن جلدی سے پھوپھی کے گھر پہنچ گیا۔ اندر برآمدے میں داخل ہوا تو کرسی کے سامنے میز پر پانی کا ٹھنڈا گلاس رکھا تھا۔ جو وہ حسب عادت گھر میں داخل ہوتے مانگتا۔ محسن نے جنداں سے پوچھا تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں جلدی آنے والا ہوں۔ جنداں نے برآمدے کی منڈیر کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، محسن جی ہم دیہات کے لوگ ہیں۔ ہمیں قدرت اشارے کر دیتی ہے۔ آپ جب بھی آتے ہیں اس منڈیر پر کوا تین دفعہ کائیں کائیں کرتا ہے۔ تو مجھے آپ کے آنے کی اطلاع مل جاتی ہے۔ محسن خاصا متاثر ہوا کہ دیہات کے لوگوں کی کمیونیکیشن کے ایسے طریقے ہیں۔ دونوں بہت دیر باتیں کرتے رہے۔ اس طرح ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک دن محسن نے جنداں سے تنہائی میں ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ فوراً راضی ہو گئی۔ تنہائی میں ملنے کا مدعا بھی بیان کیا۔ کہ میرا ایک سال کا بیٹا ہے۔ اس کی ماں نہیں ہے۔ اگر تم اسے دودھ پلا دو تو میں تمہیں منہ مانگے دام دوں گا۔ جنداں کی حس مادر کو ٹھیس پہنچی۔ محسن جی ماں کے دودھ کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ بن ماں کے بچے کی میں سیوا کروں گی۔ میں اپنی دوسری چھاتی تمہارے بچے کے لیے وقف کر دوں گی۔ لیکن یہ راز ہمارے درمیان ہی رہے گا۔ اس میں راز کیا محسن جی تم نے میرے بیٹے کو رضاعی بھائی بخش دیا ہے۔ جنداں کو محسن کی عادات بہت پسند تھیں ویسے بھی وہ اسے چاہنے لگی تھی۔ عمر میں بھی اس سے چھوٹی تھی۔

اگلے روز حسب وعدہ جنداں مقررہ وقت پر محسن کے گھر پہنچ گئی۔ جنداں ادھر ادھر بچے کو تلاش کرنے لگی۔ تو محسن نے اسے اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ وہ بچہ میں ہوں۔ مجھے میری ماں کا دودھ نصیب نہیں ہوا۔ مجھے تمہارا دودھ پینا ہے۔ جنداں فوراً سمجھ گئی اور پیار سے محسن کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ محسن جی تم تھن ٹونے ہو۔ محسن کو سمجھ نہیں آیا۔ حیرانی سے پوچھا کیا۔

جنداں نے سمجھایا ہم دیہاتی لوگ اس شخص کو جسے ماں کے دودھ کی دھار نے زندگی سے نہ جوڑا ہو اس کا ہمیشہ ماں کی روح سے رابطہ ٹوٹا رہتا ہے۔ ہم اسے تھن ٹوٹا کہتے ہیں۔ جنداں کو محسن پر رحم آیا۔ ممتا کی دولت سے بھری ہوئی خزانے کی چھاتیاں کھول کر محسن کو پیش کر دیں۔

جنداں نے بستر کے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر اپنی قمیض کو اوپر اٹھا دیا اور محسن کا سر اپنی گود لے لیا۔ سر کی گدی کو اپنی ہتھیلی سے اوپر اٹھا کر اپنے بچے کی طرح اپنی چھاتی کو محسن کے ہونٹوں میں دے دیا۔ محسن نے ہونٹوں سے جنداں کا دودھ نچوڑنا شروع کر دیا۔

جنداں کے جسم میں بجلی کی ایک تیز لہر کوند گئی۔ بے قابو ہو کر بے اختیار محسن کو سینے سے لگا کر چومنا شروع کر دیا۔ محسن نے ایک دم سے جھٹک دیا۔ غصے سے سرخ پیلا ہو گیا۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ وہ لذت اور سکون کا مادر دھارا نصیب ہو رہا تھا۔

محسن نے پھر اپنے ہونٹوں سے دودھ نچوڑنا شروع کر دیا۔ جنداں کا جسم عجیب اضطراب کے محیط سے باہر نکل گیا۔ غصے اور جنونیت نے بے بسی کی شکل اختیار کر لی۔ اُس نے بے قابو ہو کر ایک زوردار تھپڑ محسن کے منہ پر مارا۔

قمیض کو نیچے کرتے ہوئے یہ کہہ کر نکل گئی۔

مجھے چالیس سال کا بچہ نہیں۔

چالیس سال کا مرد چاہیے۔

ہری گود

آ آ آ ۔۔۔ آہ

عاصم کے جسم پہ جیسے اس کا ہاتھ رینگا۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے اس کے گلے سے عجیب سی آوازیں نکلیں۔ اس کا ہاتھ عاصم کے جسم کے اس دوراہے پہ رکا جہاں دونوں سڑکیں ایک بڑی شاہراہ میں ضم ہوتی ہیں۔ وہاں اس کے جسم کے جغرافیے کا وسط اور مرکز تھا۔

مطلع ابر آلود ہوا۔ زلزلے کا ارتعاش جسم کے پہاڑی اور میدانی علاقے میں بھونچال لے آیا۔ زوردار جھٹکوں نے آتش فشاں پہاڑ کو پھاڑ دیا۔ پہاڑ کے پھٹنے کے بعد ایک خاموشی سی طاری ہوئی اور غسل خانے میں ایک سناٹا چھا گیا۔ عاصم نے فوراً سنک میں لگی ہوئی ٹونٹی کو بند کیا۔ جو اس سناٹے کو قطروں کی ٹپ ٹپ سے توڑ رہی تھی۔

ایک اور بھونچال اٹھا۔ اس دفعہ عاصم کے جسم میں نہیں غسل خانے کے دروازے پر، عاصم کی والدہ نے دروازے کو پیٹ کر زلزلہ برپا کیا۔ دھپ، دھپ، دھپ، دھپ "عاصم دروازہ کھولو۔ اتنی دیر سے کس سے باتیں کر رہے ہو؟ کون ہے، کون ہے اندر۔" دروزاہ پھر زور سے پٹا۔

عاصم نے فوراً غسل خانے کی کھڑکی کو کھولا۔ اور ٹونٹی کو بھی پوری مقدار سے کھول

دیا۔ ہاتھ منہ دھو کر فوراً کپڑے پہن لیے۔

''کیا ہے ماں۔'' دروازہ کھولتے ہوئے عاصم نے جواب دیا۔ ''کون ہے اندر۔'' عاصم کو دھکا دیتے ہوئے عاصم کی ماں اندر گھس آئی۔ اندر کوئی بھی نہ تھا۔ ''کھڑکی کیوں کھلی ہے۔ کون تھی اندر۔ کس کو بھگایا ہے۔ کس سے عجیب وغریب باتیں کر رہے تھے؟'' ''میں ہوں، بس میں ہوں ماں۔ میں یہاں اکیلا ہوں کوئی بھی نہیں ہے۔''

عاصم کی ماں نے شاور کرٹن کے پیچھے سے لے کر چھوٹے غسل خانے کی ہر چیز کی پوری طرح تلاشی لی۔ لیکن کچھ نہ پایا۔ ''کیا بکواس بک رہے تھے اور کیا کر رہے تھے؟''

''کچھ بھی تو نہیں ماں۔۔۔ تمھیں بس وہم ہوا ہے۔''

عاصم کی ماں بنا کسی ثبوت کے چپ رہ گئی۔ ''تمہارے چال چلن ٹھیک نہیں ہیں۔ آ جانے دو تمہارے ابا کو وہی تمہیں سبق سکھائیں گے۔''

عاصم کی ماں کی تشویش پریشانی میں بدل گئی۔ فکر اور سوچ نے دل اور دماغ پہ قبضہ کر لیا۔ عاصم کی ہر حرکت پہ نہ صرف خود کڑی نگرانی شروع کی بلکہ پوری سیکرٹ سروس ٹیم بنا کر عاصم کی سراغ رسانی پر لگا دی۔ چھوٹے بیٹے کو جیمز بانڈ کا عہدہ سونپا جو اس نے بڑی خوشی اور جوش کے ساتھ قبول کر لیا اور فوراً اس پر کارروائی عمل میں لے آیا۔ اس کی ہر حرکت کی اطلاع چھوٹی بہن منی پٹی سے براہ راست ہیڈ کوارٹر کو پہنچتی لیکن والدہ حضور کی سیکرٹ سروس کو کوئی خاطر خواہ ثبوت مہیا نہ ہوا۔

رات کو پھر عاصم کے جسم کو کسی نے چھوا۔ اس کے ہاتھ کا چھونا عاصم کے جسم کے ہر مسام کو لطف سے بھر دیتا۔ خوشی اس کے چہرے سے پھول کی طرح کھلتی۔ صبح کی اوس اس کے ننگے پاؤں کو میٹھی ٹھنڈک سے بھگو دیتی۔ سکون کی میٹھی نیند اس کے پاؤں دباتی۔ تھکاوٹ اس کی کن پٹیوں پر مالش کر کے بھاگ جاتی۔ ہر رات عاصم کے کمرے سے سسکی بھری دھیمی دھیمی آوازیں آتی رہتیں۔ کئی مرتبہ پوری ٹیم نے کمرے پہ دھاوا بولا لیکن ہر دفعہ

عاصم دروازہ کھلنے سے پہلے کمرے کی کھڑکی کھول چکا ہوتا۔ اور پوری ٹیم کی ہر خاطر خواہ کوشش کے باوجود گولڈ فنگر تو کیا اس کا ناخن بھی نہ ملا۔

ہر دفعہ کی ناکامی نے ماں کو اور بھی تشویش کے بھنور میں پھنسا دیا۔ عاصم کی ماں نے اس مسئلے کو اور بھی سیریس لیا۔ بچوں کی ٹیم کو برخواست کیا کہ مسئلہ کچھ زیادہ پیچیدہ ہے۔ اور اڑوس پڑوس کے بزرگوں سے رجوع کیا۔ لیکن کوئی خاطر خواہ حل نظر نہ آیا۔ لیکن گھر کی نوکرانی کا مشورہ دل کو لگا۔ مشورہ کی تصدیق نوکرانی کے خاوند نے کر دی تو بیگم صاحب کو یقین آ گیا کہ شادی سے پہلے نوکرانی کے خاوند پر ایک پری کا سایہ تھا۔ وہ بری طرح اس پر عاشق ہوگئی تھی۔ بڑی مشکل سے پیر جھنڈے شاہ کے چلے سے نوکرانی کے خاوند کو افاقہ ہوا۔

عاصم کی ماں تعلیم یافتہ تو تھی لیکن بیٹے کو کھو دینے کے خوف نے عجیب و غریب خیالوں کے جال نے جکڑ لیا۔

ہاں۔۔۔ عاصم ہے تو وجیہہ و شکیل نوجوان بچہ۔ کرکٹ کھیلتے ہوئے جب ہاتھ گھماتا ہے تو لڑکیوں کے دل گیند سے پہلے گھومتے عاصم کے بلے سے جا ٹکراتے ہیں۔ ہوں۔۔۔ لیکن میں نے کبھی عاصم کو کسی لڑکی میں دلچسپی لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بس یہ تو اپنے باپ کی طرح بڑا مغرور ہے۔ کوئی پری ہی ہوگی جو اسے پسند آئے گی۔ فوراً عاصم کی ماں ڈر کے مارے کھڑی ہوگئی۔ اور فوراً نوکرانی کو حکم دیا۔ پیسوں کی پروا کیے بغیر جو بھی نذرانہ ہو ہر قیمت پر پیر جھنڈے شاہ کا بندوبست کرو۔ لہٰذا جمعرات کو پیر صاحب نے گھر کے صحن میں مرچیں، پیاز اور نہ جانے کیا کیا جلا کر دھویں سے پورے گھر کو چھینکوں سے ہلکان کر دیا گیا۔ جتنی چھینکوں کی تعداد بڑھتی پیر صاحب اور جلال میں آ جاتے۔ سرخ آنکھوں سے نعرہ دار آواز میں چیختے۔ ''نکل اس گھر سے جان چھوڑ عاصم کی۔'' بوتل میں دم کیا ہوا پانی عاصم کے کپڑوں، بستر اور ہر اس جگہ چھڑکا گیا جہاں عاصم کی پہنچ تھی۔ عاصم کی ماں کو کچھ سکون آیا۔ بڑی مقدار میں مٹھائیاں، کھانا مسجد میں نیاز کی نذر کیا۔ صدقہ بھی نکالا اور

گوشت عاصم پروار کے پانی میں پھینکا۔

سب کا سب رائیگاں گیا کیونکہ عاصم کے کمرے سے آوازیں آنے کا تانتا بند نہ ہوا۔ عاصم کی ماں نے پیر جھنڈے شاہ کو بہت کوسا۔ عاصم کی ماں نے سارا معاملہ عاصم کے والد کے آگے کھول دیا۔ وہ بہت ہنسے اور ان کا مذاق اڑایا کہ اس ترقی یافتہ دور میں تم کیسی جاہلوں والی سوچ رکھتی ہو۔ مجھے تو تم وہ پری چڑیل لگتی ہو جو اس سے چمٹی ہوئی ہو۔ چھوڑو اسے۔ کچھ بھی ایسا نہیں ہے۔ وہ اب اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے۔ جینے دو اس کو اس کی زندگی وہ بڑا ہو گیا ہے وہ بچہ نہیں رہا۔

کچھ عرصہ تک تو عاصم کی ماں کو تسلی رہی کہ اس سائنسی دور میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ لیکن جلد ہی انسانی رشتوں کے تجسس کے ایک اور خوف نے اُسے آن گھیرا۔

کہیں عاصم لڑکیوں کے بجائے لڑکوں کو پسند نہ کرتا ہو۔ کیا پتا اس جدید دور میں رشتوں کی مختلف زاویوں سے آشنائی کا۔ آج کل کیا پتا ہم جنس ہونا تو فیشن ہے۔ اب تو شہر میں ہم جنسوں کے کلب بھی کھلتے جا رہے ہیں۔ کہیں عاصم غیر فطری بہاؤ میں تو نہیں بہہ گیا۔

ایک اور بڑی پریشانی نے آن گھیرا۔ عاصم کے ہر دوست پر شک کرتی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں نے عاصم کی ماں کے اندر ایک شک کا پہاڑ کھڑا کر دیا۔

وہ کئی پیروں کے دربار پر جا کر پھوٹ پھوٹ کے رو کر دعا مانگتی۔ اس کو لڑکوں سے بچاؤ۔ ہم جینے کے قابل نہیں رہیں گے۔ میں آسیب قبول کراوں گی لیکن لڑکوں والی بدنامی کو برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ جیسے ہی عاصم کالج سے واپس آیا اس کے کمرے میں جا کر ہاتھ جوڑ کر اس سے روتے ہوئے التجا کرنے لگی کہ بیٹے سچ سچ بتاؤ تمہیں لڑکیاں پسند ہیں۔ یاسر نے غصے میں تنگ آ کر جواب دیا۔ ''نہیں نہیں نہیں۔'' عاصم کی ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے یقین ہو گیا کہ عاصم لڑکوں کو پسند کرتا ہے۔

ہائے ہائے ہمارے خاندان کی عزت مٹی میں ملا دی تم نے۔ اس سے اچھا تھا پیدا ہی نہ ہوتے۔ کسی کالی کلوٹی بھنگن سے اپنا منہ کالا کر لیتے۔ کوئی بلا تجھے چمٹ جاتی میں برداشت کر لیتی۔ ہائے یہ کیا کیا تم نے۔

عاصم کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ''ماں تم سمجھ کیا رہی ہو۔ کہنا کیا چاہتی ہو۔ صاف

صاف بتاؤ۔"" عاصم تم قسم کھاؤ تم سچ سچ بتاؤ گے۔"

"ہاں ماں تمہاری قسم سچ سچ بتاؤں گا۔"

"بیٹے تم لڑکوں کو پسند کرتے ہو کیا؟" عاصم چیخا۔ "ماں تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو۔"" ہاں کیا تمہیں لڑکے پسند ہیں۔"" نہیں نہیں ماں۔"" مجھے نہیں پسند، کیا اول فول کہہ رہی ہیں آپ۔"

عاصم کی ماں نے سسکیاں لیتے ہوئے عاصم کا ہاتھ اپنے سر پر رکھا۔" کھاؤ قسم تمہیں لڑکے پسند نہیں ہیں۔" عاصم نے سچ مچ ماں کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ اسے لڑکے پسند نہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور یہ وعدہ لیا کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو گی۔

عاصم کی ماں کو تسلی ہوگئی۔ پھر نذرانہ اور نیازیں بانٹی گئیں لیکن عاصم مسلسل کسی کو ملتا رہا۔ آزادی سے کبھی اپنے بیڈ روم میں، کبھی غسل خانے میں، کبھی کوٹھے کی چھت پر لیکن ماں کو تسلی تھی اور اعتبار تھا عاصم کی قسم کا۔ اور کبھی کسی نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔

کافی دن گزرنے کے بعد عاصم نے اپنے دائیں ہاتھ میں کچھ تبدیلی دیکھی۔ بالکل ہتھیلی کے وسط میں ایک غبارہ سا آبلہ پھولنے لگا اور بڑا ہونا شروع ہوگیا۔ عاصم خاموش رہا اور اس کا کسی کو ذکر نہیں کیا۔ ہاتھ کی سوجن کی تکلیف بڑھنے لگی۔ ایسے لگتا تھا اس کی ہتھیلی حاملہ ہوگئی ہے۔ ایک رات تکلیف اتنی بڑھی کہ اس کے ہاتھ کی انگلیاں درد سے تڑپ رہی تھیں۔ ہاتھ کے درمیان کی دو انگلیوں کے درمیان درد اور بھی بڑھنے لگا۔ عاصم نے دوسرے ہاتھ سے پھولی ہوئی ہتھیلی کے پیٹ کو مسلنا شروع کر دیا۔ تکلیف اس کی حد برداشت سے بڑھ رہی تھی۔ اس نے اور زور سے اپنی ہتھیلی کو بھینچا۔ دو درمیانی انگلیوں کے درمیان والی جگہ سے ایک چاندی بچی پیدا ہوئی۔ عاصم نے فوراً اپنا ہاتھ اپنی پسلی پر رکھ کر بچی سے پوچھا۔

کیا تم حوا ہو؟

ہاں آدم میں تیری حوا ہی تو ہوں!

☆☆☆

نسلوں کا پرودگار

گھر ژ گھٹ کوں۔۔۔ٹلو نے گھوم کے دیکھا کہ شاید کتو بر ہیں، دائیں بائیں پیچھے کوئی چرند پرند نظر نہیں آیا۔ ٹلو پھر اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہی آوازیں آئیں۔ کچھ غور کیا تو اس کا اپنا پیٹ بول رہا تھا۔ بڑی عاجزی سے ٹلو کو بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جسم کا ایندھن ختم ہے۔ چلنا دشوار ہو جائے گا۔ ٹلو نے ایندھن ڈھونڈنے کا کام اپنی ناک کو سونپا۔ حکم نامہ فوری جاری کیا فوراً مطلع کرو۔ ناک نے اپنے نتھنوں کو پھلا کر سکیڑ کر حکم پر عمل جاری کر دیا۔ گاڑیوں، موٹروں اور گندگی کے ڈھیروں کی بدبو کو نظر انداز کرتے ہوئے کھانے کی خوشبو پر دھیان باندھا۔ دیگ کے مرغ مسلّم کی خوشبو نے ٹلو کے جسم کو چوکنا کر دیا۔ اور ناک کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہو گیا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹلو کے قدم سہلا خان نوانہ کی حویلی کے مردان خانہ پر جا کر رک گئے۔ جہاں چھ کھانوں کی دیگیں آگ کے بڑے بڑے چولہوں پہ چڑھی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے چمچوں کی کھنک اس کی بھوک کو اور بھی تیز کر رہی تھی۔ ٹلو سے رہا نہیں گیا۔ اللہ دتہ جس کو سہلا خان نوانہ ہمیشہ دِتو نائی پکارتا تھا، سے جا کر پوچھا۔ "یہ عظیم الشان دعوت کی تیاری کس لیے ہو رہی

ہے. کہیں نواب صاحب چوتھا بیاہ تو نہیں رچا رہے۔''

''نہیں ٹلو نواب صاحب کا بیل بیساکھی کے میلے میں مقابلہ جیت آیا ہے۔'' اللہ دتہ نے بیل کی طرف اشارہ کیا۔ ٹلو نے قریب جا کے بیل کو دیکھا۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں ہر پر سینگ جیسے سکندر اعظم نے فولادی خود سے سر ڈھانپا ہو۔ کسرتی سڈول جسم جیسے یونانی پہلوان چار پانچ سیاہ فام غلاموں کو پچھاڑ چکا ہو۔ ٹلو کو قریب دیکھ کر بیل نے ٹانگ سے زمین کو کھرچا اور سر ہلایا اور ناک سے اژدھے والی پھونکار نکالی۔ ٹلو ڈر کے واپس اللہ دتہ کے پاس آ گیا۔

اللہ دتہ نے بڑے فخر سے بتایا یہ دھنی کی نسل کا بیل ہے۔ یہ نسل دنیا میں بہت کم ہے۔ اتنے میں نواب سہلا خان چھاتی نکالے مردان خانے میں داخل ہوئے۔''او دتو نائی۔۔۔کہاں مر گئے ہو حرام زادے۔۔۔۔کتنی دیر ہے دیگیں پکنے میں۔ مہمانوں کے آنے کا وقت ہونے والا ہے۔ تمہیں پتا ہے سب اونچے شملے والے بڑے بڑے خاندانوں کے لوگ آج ہماری دعوت میں شمولیت کرنے آ رہے ہیں۔ ہمارے خاندان کا نام تو انگریز سرکار بھی عزت سے لیتی تھی۔'' ''جناب تھوڑی دیر میں کھانا پک جائے گا۔'' اللہ دتہ نے کہا۔'' کمدا مصلی کہاں ہے؟'' ''جناب میں ابھی تلاش کرتا ہوں۔'' اللہ دتہ نے خدا بخش کو بلایا۔ اور خود دیگیں پکانے میں مصروف ہو گیا۔

نواب صاحب بڑے بان کے بندھے موڑھے پر براجمان ہو گئے۔ اور خدا بخش کو حکم دیا۔ ہماری مالش کرو اور حکم دیا۔ بشیرو نائی کو بلاؤ ہماری شیو کرے۔ خدا بخش نے بشیرو کو بلایا اور خود مالش کرنے میں مصروف ہو گیا۔'' کمدا مصلی تمہیں پتا ہے دھنی نسل کے بیل کی کیوں اتنی عزت ہے۔ کیونکہ یہ تیز بھاگتا ہے۔ کسی کو اپنے قریب نہیں لگنے دیتا۔ یہ اس کی نسل کی خاصیت ہے۔ بالکل ایسے جیسے جرمن شیپرڈ ہر چیز کو سونگھ لیتا ہے۔ ہر نسل کی اپنی اپنی صلاحیت ہوتی ہے۔ میں سلام کرتا ہوں انگریز سرکار کو جو ان نسلوں کو عزت بخشتا تھا۔ میرے

والد حضور نواب اللہ داد خان صاحب کو کچہری میں کرسی ملتی تھی ۔ ہمیں مارشل ریس کہا جاتا تھا۔ میرے خاندان کے کسی بھی فرد کو کمیشنڈ افسر کا فوج میں عہدہ ملتا تھا۔ تم کمیوں کو کبھی افسر نہیں لگاتے تھے۔ یہ ہوتی ہے نسل کی عزت اور حرمت۔''

نواب صاحب کے جسم کی مالش نے ان کے جسم کے خون کی حرارت کو تیز کر دیا اور اوپر سے سورج کی شعاعوں نے جلتی پہ تیل کا کام دکھایا۔ ایک دم یوں کھڑے ہوئے جیسے ان کا دشمن بیل مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ اور سب کو حکم دیا کہ اپنے اپنے کاموں میں جت جاؤ اور باہر نکل گئے۔ نلو بھی بھوک سے مرا ہوا ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ شاید مجھے بھی دعوت میں مدعو کر لیں۔ لیکن نلو میں ہمت نہ پڑی کہ خاں صاحب سے کچھ کہہ سکے۔ بس نواب صاحب بے قابو سانڈھ کی طرح اِدھر اُدھر کسی چیز کی تلاش میں تھے۔

نلو نے سوچا کہ شاید خان صاحب میری طرح بھوکے ہیں۔ خوش ہوا کہ شاید میرا بھی کام بن جائے۔ میرے پیٹ کی آگ بجھ جائے۔ لیکن نواب کے تو پیٹ کے نیچے آگ لگی تھی۔ لہٰذا پاس سے گزرتی ہوئی خدا بخش مصلی کی بیوی کو بازو سے پکڑ لیا۔ اور حویلی کے پیچھے والے کمرے میں اسے لے گئے۔

تھوڑی دیر بعد پہلے خدا بخش کی بیوی اپنی دھوتی درست کرتی ہوئی نکلی اور بعد میں خاں صاحب نے دو گالیاں دیں۔ اور کہا ''مصلیوں کا تو ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کوئی نہیں کھاتا۔ ہم تو تجھے عزت بخشتے ہیں۔ خوش ہو چوہڑی مصلن تجھے ہم نے عزت بخشی۔'' نلو کو یوں لگا جیسے انگریز سرکار نواب صاحب کے باپ دادا کو کچہری میں کرسی دے کر عزت بخشتی تھی اسی طرح یہ نیچ نسل کے کمیوں عزت کو دیتے ہیں۔

نواب صاحب نہا دھو کر نئی پوشاک پہن کر باہر آئے تو پیر بختاور شاہ کے گدی نشین پیر ناگ سلطان کا منشی ہاتھ میں نوٹوں کی گڈیاں لیے کھڑا تھا۔

''ہاں پیر ناگ سلطان کے منشی دعوت میں پیر صاحب نے تمہیں شمولیت کے

لیے بھیجا ہے۔"

"نہیں سرکار میں تو ان کا پیغام لایا ہوں۔ وہ تو بعد میں تشریف لائیں گے۔"

"پیر صاحب کا پیغام ہماری سر آنکھوں پر۔ ان کا حکم سناؤ۔" "جناب انہوں نے پانچ لاکھ کا نذرانہ بھیجا ہے۔ اور ان کی تمنا ہے آپ کے دھنی بیل کا بچھڑا ہماری گائے کے پیٹ میں پلے۔ ہمیں اس نسل کا بیل چاہیے۔ سہلا خان صاحب کچھ پریشان ہو گئے۔ اور بڑی انکساری سے التجا کی یہ ہم سے نہ ہوگا اور پیر ناگ سلطان کو پیسے لوٹا دیں اور ہماری طرف سے معافی مانگ لیں کہ ہم نسلوں میں ملاوٹ نہیں کرتے۔ یہ ہماری عزت اور شان کا سوال ہے۔

آخر کار دعوت کا اہتمام مکمل ہو گیا۔ بڑے امرا دعوت میں شمولیت کے لیے دور دراز علاقوں سے اپنے گھوڑوں پہ، گاڑیوں پہ، دس دس نوکروں کے ساتھ تشریف لائے۔ حویلی سرخ، پیلی، نیلی بجلی سے چلنے والی مرچوں اور بلبوں سے سجی تھی۔ حویلی کی دیواروں پر لگے چھوٹے بلب ایک دوسرے کا تعاقب ایسے کر رہے تھے جیسے وہ بھی اپنی نسل کو ڈھونڈ رہے ہوں۔ میزوں پر کھانے سجے تھے۔ ایک ایک میز پر چھ چھ نوکر کھڑے تھے۔ میزوں کے درمیان ایرانی غالیچوں کی لمبی قطار لگی تھی۔ جہاں غالیچے ختم ہوتے وہاں پر ایک چھوٹا سٹیج سجا تھا اور اس سٹیج پہ دو چاندی اور تانبے کی تخت نما بڑی کرسیاں پڑی تھیں۔

آخر کار رنلو کو بھی کھانا مل گیا۔ خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ جان میں جان آئی آنکھوں کی روشنی تیز ہوئی۔ تو یہ دیکھ کر بالکل حیران رہ گیا کہ تخت نما دو کرسیوں پر ایک تو سہلا خان صاحب بیٹھے تھے ساتھ والی کرسی پر ان کا بیٹا شمشیر خان بیٹھا تھا لیکن ان کے بیٹے شمشیر خان کی شکل بالکل خدا بخش مصلی سے ملتی تھی۔

☆☆☆

پیک اے بو

"باندر کلہ"

مادو نے گلی میں کھڑے ہو کے زور سے نعرہ لگایا اور سب لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے گھروں سے نکل کر گلی کے ساتھ لگی سکول کی دیوار کو پھلانگ کر گراؤنڈ میں پہنچ گئے۔ باندر کلہ ہمارے دیس کا ایک کھیل ہے۔ بالکل جیسے گلی ڈنڈا' پٹھو گرم' کوکلا چھپا کی' شٹاپو' لوکن میٹی' ان سب کھیلوں میں ہار جیت نہیں ہوتی بس سب کھیلتے رہتے ہیں۔ جب تھک جاتے ہیں یا گھر سے آواز پڑتی ہے کھیل بغیر ہار جیت کے ختم ہو جاتے ہیں۔ ہار جیت کا خیال بدنیتی ہے۔ فتح کرنا' محکوم بنانا' کھیل میں بھی نفرت' کھیل تو سب محبت اور پیار کے بہلاوے کی چیزیں ہیں۔ اس میں پیار کی بھی کئی تہیں چھپی ہوتی ہیں ان تہوں کی پاداش کبھی کبھی حالات کے ان علاقوں میں پہنچا دیتی ہے جو ہمارے معاشرے میں نا قبول ہے۔ معافی چاہتا ہوں میں بہت دور چلا گیا ہوں۔

باندر کلہ۔ مادو نے گراؤنڈ میں کلہ ٹھونکا' کلہ کے ساتھ ایک رسی باندھ دی' سب لڑکے لڑکیوں نے کلے کے ارد گرد اپنی جوتیاں جمع کر دیں۔ کھیل کے اصول کچھ اس طرح

سے ہوتے ہیں۔ کلے سے بندھی رسی کو ایک کھلاڑی اپنے ایک ہاتھ سے تھامے ہوتا ہے جہاں تک رسی کی حد ہے۔ وہ کھلاڑی کی پہنچ کا دائرہ ہے۔ اس کھلاڑی کو بندر کہتے ہیں جس نے ان تمام جوتوں کی رکھوالی کرنی ہے۔ باقی کے کھلاڑیوں نے ہر ممکن طریقے سے وہ تمام جوتیاں اٹھانی ہوتی ہیں۔ اگر بندر کھلاڑی کسی کو چھو لے تو وہ بندر بن کے کلے پہ بندھ جاتا ہے اور جوتیوں کی رکھوالی کرتا ہے اور اگر سب جوتیاں باقی کے کھلاڑی حاصل کر لیں تو انہی جوتیوں سے بندر کی پٹائی ہوتی ہے۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے سب ایک لائن میں کھڑے ہو گئے۔ مادو سب سے پہلے کھڑا تھا پھر اس کی بہن جمیلہ، اس کے بعد باقی لڑکے لڑکیاں سب ہی تقریباً ہم عمر تھے۔ گیارہ سے چودہ سالوں کے پیٹے میں ہوں گے۔ مادو نے منہ میں انگلی ڈال کے اڑوں اڑوں اڑوں کر کے اکڑ بکڑ بمبے بھو۔ اسی نوے پورا سو سو کو لوٹا تتر موتا چل مداری پیسہ کھوتا۔ کھوتا کا لفظ گھوم کر مادو پہ ہی آ کر ختم ہوا۔

اور مادو کو بندر بننا پڑا۔ مادو کلے پہ بندھا بندر کی طرح دوڑ دوڑ کے جوتیوں کی حفاظت کر رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ کسی کو چھو لے۔ کلے کے ادھر بھاگ اور کبھی ادھر کھیل میں خاصی گرما گرمی تھی۔ ایک شور مچا تھا۔ مادو کسی کو بھی پکڑنے کی پوری کوشش میں تھا کوئی ہتھے نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے دیکھا اس کی بہن جمیلہ تاک میں ہے بھاگ کر جمیلہ کو چھونے کی کوشش میں ہاتھ رسی سے چھوٹا اور پاؤں ایسا الجھا کہ جمیلہ اور مادو دونوں انجانے میں الٹے پلٹے گرے۔ دونوں گول ڈرم کی طرح لڑھکتے گئے۔ انجانے میں مادو کا ایک ہاتھ جمیلہ کی چھاتیوں پر دوسرا اس کے کولہوں پر دونوں گھبراتے کپڑے جھاڑتے اٹھے۔ مادو کے ہاتھ سے رسی چھوٹنے کی وجہ سے ابھی جوتیاں پڑنے والی تھیں کسی کے گھر سے آواز پڑی اور سب بھاگ گئے۔

گرمیوں میں سب رات کو مکان کی چھت پہ سوتے تھے۔ اوپر چھت پہ چارپائیاں چڑھانا اتارنا خاصا مشکل ہوتا تھا۔ اس لیے جب بارش آتی تو چارپائیاں بھیگ

جانے سے بچاؤ کے لیے چھت پہ ہی ایک کمرہ بنا دیا جس میں صرف گرمیوں میں چارپائیاں اور بستر رکھ دیے جاتے تھے۔ اس کمرے کی چھت پہ جانے کے لیے کوئی سیڑھی کا بندوبست نہیں تھا لیکن اس کی چھت مادو اور جمیلہ کی سب سے پسندیدہ جگہ تھی۔ گڈیاں اڑانے اور لوٹنے کے لیے سب سے مناسب جگہ تھی۔ وہاں پہنچنے کے لیے مین چھت کی دیوار پہ چڑھ کے چارپائیوں والے کوٹھے کے دروازے کی چوکھاٹ پہ پاؤں ٹکا کر چڑھنا پڑتا تھا۔ مادو اور جمیلہ کو اتنی پریکٹس تھی وہ کوٹھے پہ سیڑھیوں سے زیادہ تیزی سے چڑھ جاتے تھے۔

رات کو چھت پہ سب سوئے ہوتے تھے مادو کو سوتے ہوئے جمیلہ سے لپٹنے کا منظر بار بار انگلیاں چبھو رہا تھا اور ہر دفعہ وہ اپنے سر کو جھٹک دیتا۔ توبہ توبہ کر کے کانوں کو ہاتھ لگاتا۔ رات کے پچھلے پہر مادو کی امی نے دیکھا کہ مادو نیند میں اٹھا اور چلنے لگا۔ پہلے ماں نے سمجھا اجابت گاہ جا رہا ہوگا کیونکہ اجابت گاہ بھی کوٹھے کی چھت پر ہی تھی۔ اس لیے مین کی چھت تھی کسی دن جمعدارنی گندگی اٹھانے نہ آتی تو چھت پہ سونا محال ہوتا لیکن مادو دیوار پہ چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جس سے چارپائیوں والے کمرے کی چھت پہ چڑھتے تھے۔ ماں نے فوراً دبوچ لیا اور لگی مادو کو جھنجھوڑنے۔ مادو اوں آں کر کے غنودگی میں پھر سو گیا۔

دوسرے دن شام کو سونے سے پہلے ماں نے مادو کے سر پہ زیتون کے تیل کی خوب مالش کی اور چارپائی کے چاروں پایوں کے نیچے مٹی کے پیالوں میں پانی بھر کے رکھ دیا تاکہ چیونٹیاں چارپائی پہ نہ چڑھ سکیں۔ ماں نے کسی سے ذکر بھی نہیں کیا بے فکر ہو کے سو گئی لیکن رات کو پھر مادو نیند میں اٹھ کے اسی دیوار پہ بند آنکھوں کے چلنے لگا۔ دیوار پہ چل کے چکر پورا کر کے آ کے اپنے بستر پہ لیٹ گیا۔ مادو کا نیند میں چلنے کا عمل باقاعدہ شروع ہو گیا۔ کبھی کوئی دیکھ لیتا تو پکڑ کے بستر پہ لٹا دیتا۔ ادھر جمیلہ کے والدین کو بھی جمیلہ کے ماہانہ دنوں کا حساب ستانے لگا۔ جتنے دن ماں باپ کے گھر بڑھیں گے، اتنا عذاب ماں باپ کے سر چڑھے گا لہٰذا رشتے کے لیے دور نزدیک کی مچھیے کٹنیوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ایک

اپنے قریبی رشتہ داروں کے لڑکے سے بات چیت چلی۔ خاندان سے خاصی پہچان تھی شکیل حسین کی سرگودھا کے سیٹلائٹ ٹاؤن میں ریڈیو کی دکان تھی وہ جمیلہ کو دیکھنے آیا۔ رشتے داری تھی۔ پہلے بھی کئی مرتبہ آ چکا تھا لیکن اس دفعہ وجہ خاص تھی اس لیے دو تین راتوں کے رک جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن جمیلہ ابھی صرف بارہ سال کی ہی ہوگی تو پردے میں بھیج دیا گیا۔ مادو کو سارا وقت شکیل کے ساتھ ہی گزارنا پڑا۔ پہلے جمیلہ اس کے ڈور کی چرخی پکڑتی۔ چار پائیوں والے کمرے کی چھت پہ گڈی اڑاتے کبھی کبھی وہ جب گڈا تناہوتا تو اس کی ڈور جمیلہ کو تھما دیتا۔ جب گڈا دائیں بائیں غوطہ لگانے لگتا تو جھٹ سے ڈور تھام لیتا۔ اسے تنکا مارنا سکھاتا۔ کبھی کبھی وہ گڈی کو کنی بھی دیتی۔ جب کسی کی مقابلے میں گڈی کاٹ دیتا تو سب سے زیادہ بوکاٹے کا شور جمیلہ ڈالتی۔ بس بوکاٹے کے استقبال میں جمیلہ سب کام کرتی۔ شکیل اور مادو نے ڈور بنانے کی ٹھانی۔ بڑا اسپیشل برانڈ کا دھاگہ خریدا۔ مانجھا تیار کرنے کے لیے بلب کے شیشے کا سفوف، چیل کے انڈے، اسپیشل سریش کے مرکب کا مانجا پورا دن کوٹھے کی چھت پہ اینٹوں کے چولہے پہ کڑھتا رہا۔ تمام دن چھت پہ شکیل اور مادو نے ڈور کو چھت کی دیوار پہ دو درختوں کی ٹہنیوں پہ سوت کے سوکھنے کے بعد جب پنا لپیٹا تو کئی دفعہ مادو کی انگلی کٹ گئی۔ رات کو سب حسب معمول چھت پہ سونے چلے گئے۔ ساری رات مادو جوش کے ساتھ گڈی اڑانے کی ڈینگیں مارتا رہا۔ رات کو پچھلے پہر مادو پھر نیند میں چلنے لگا۔ اس دفعہ عجیب واقعہ پیش آیا۔ مادو سوتے میں اٹھا اور چھت پہ جہاں اینٹوں کے چولہا پہ مانجھا کا مرکب بنایا تھا وہاں گیا۔ ٹین کے ڈبے میں بچا ہوا مانجھا اٹھا کر سوتے میں شکیل کے اوپر انڈیل دیا۔ شکیل کے شور سے سارا گھر جاگ گیا۔ مادو نیند کی غنودگی میں اس واقعہ سے بالکل لاعلم تھا۔ جب ماں نے جھنجھوڑا تو بالکل بیہوش تھا۔ تمام گھر والوں کو بہت شرمندگی اٹھانی پڑی۔

اس دفعہ تو مادو کے والد صاحب نے دو تین جھانپڑ جڑ دیے۔ مادو خود بھی بہت

شرمندہ تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ شکیل تو واپس گھر چلا گیا لیکن گھر والوں کی تشویش بڑھ گئی۔ ہر رات سونے سے پہلے سرسوں اور زیتون کے تیل کی مالش کے بعد زبردستی مادو کو سورہ یٰسین بھی پڑھائی جاتی اور ماں بھی چار پانچ سورتیں پڑھ کے پھونک دیتی۔

ایک دن چار پائیوں والے چوبارے پہ گڈی اڑاتے نیچے دیکھا تو بالکل دل دھک سے رہ گیا۔ بابا کتنا فاصلہ ہے چھت سے گلی تک، اگر میں گروں تو ہڈیوں کا تو ما نجھا بن جائے گا لیکن رات کو سوتے میں پھر اسی دیوار پہ چڑھ کے چلنے لگا۔ اور بالکل نہیں ڈر لگا۔ پھر ماں نے آرام سے پکڑ کے نیچے اتار لیا۔ اس بار تو ماں کو بہت تشویش ہوئی اور ٹھان لی کہ کچھ بھی ہو مادو کا علاج ضروری ہے ورنہ بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ کئی حکیموں سے رجوع کیا گیا کوئی کہتا کہ معدے کے بخارات دماغ کو چڑھ جاتے ہیں۔ اس کو قبض کشا گلقند کا مشورہ دیتے تو کوئی کچھ کہتا' تعویز گنڈے بھی کیے گئے۔

لیکن اس کے والد کے چچازاد بھائی نے جسے مادو دادا کہتا گھر والوں کو مشورہ دیا اسے ہفتے کے لیے میرے پاس لاہور میں چھوڑ جاؤ۔ مادو کچھ دنوں کے لیے ان کے ہاں رک گیا۔ وہ مادو سے اس کی ہر روز کی واردات سنتا۔ اس کے شوق ،مشغلے ، پڑھائی اور خواہشات ہر پہلو پہ باتیں کرتا۔ آہستہ آہستہ دوستی بڑھ گئی اور گزرے ہوئے دنوں کی باتیں سنتا۔ جب سے اس نے نیند میں چلنا شروع کیا تھا اس سے پچھلے ہفتے کی پوری روداد سنتا۔ بزرگ اس کا خوب خیال رکھتا۔ اسے خرچے کے لیے پیسے بھی دے دیتا۔ کبھی کبھی سینما دیکھنے بھی چلے جاتے۔

ایک دن دادا نے پوچھا '' تم سوتے میں کیوں چلتے ہو؟'' مادو نے کہا '' میں تو بالکل نہیں چلتا یا مجھے اس کا بالکل علم نہیں ہے۔'' بزرگ دادا نے ایک بڑے پتے کی بات مادو کو بتائی۔ برخوردار جب کوئی انسان اپنی کوئی چھپی ہوئی خواہش جس کا وہ اظہار نہ کر سکے اور اس خواہش کا گلا گھونٹے رکھے تو وہ جب اپنی دنیا میں جاگ رہا ہوتا ہے تو اس میں کسی اور

شکل میں کچھ اور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نیند میں چلنا یا نیند میں کسی خطرناک عمل کا مرتکب ہو جانا خاصا خطرناک ہے جس کا اسے بالکل علم نہیں ہوتا اور مادو کو کچھ رقم دے کر کہا کہ جاؤ اسے بے دھڑک ہو کے جہاں دل چاہے خرچ کر دو۔ مادو ہر رات کے وسط میں شاہی محلے پہنچ جاتا۔ شاہی محلے کی تنگ گلیوں میں کمروں میں عورتیں اور لڑکیاں میک اپ کر کے کرسیوں پہ بیٹھی ہوتیں۔ طبلے، سارنگی اور ہارمونیم پہ بیٹھے سازندے جیسے ہی کوئی کمرے کے سامنے سے گزرتا موسیقی زور زور سے بجانی شروع کر دیتے۔ مادو ہمت کر کے ایک کمرے میں گھسا تو اس کی عمر اور حلیے سے اندازہ لگا کر سازندے اسے باہر نکال دیتے لیکن گلی کے باہر بازار میں پھول کی دکانوں کے باہر لڑکے موتیے کے ہار ڈنڈی پہ لٹکائے ہار اور گجرے، پان سگریٹ کے کھوکے گلی میں مرغ حلیم اور چنے کے پتیلے۔ نالی میں گرا گند ساتھ ہی پڑی ہوئی الٹیاں اور پان کی پیکوں کے نشان اسے عجیب سماں لگتا جیسے وہ کسی اور دنیا میں ہو۔ ہر رات وہاں جانے لگا نہ جانے کون سی قوت اسے وہاں کھینچ لے جاتی تھی۔ دو تین دنوں کے بعد وہ کچھ اکتا سا گیا اور شاہی محلے کی دوسری گلیوں میں کچھ اور ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

اندھیری گلیوں میں ہر دوسرے گھر کے باہر یہ بورڈ لگا ہوتا۔ ''دروازہ مت کھٹکھٹاؤ یہ شریفوں کا گھر ہے۔''

انہی گلیوں میں گھومنے لگا۔ ایک رات کو ایک کالا سا شخص جس کے کاندھے پہ رومال لٹک رہا تھا مادو کو دیکھ کے رک گیا اور بولا'' بابو مال چاہیے۔'' مادو سمجھ گیا۔ اسی کی تلاش تھی۔ ہاں بابو قندھاری انار ہے، جنت کا میوہ۔ مادو نے پوچھا کتنے پیسے، سوڈے کی بوتل، اس کا کمیشن نیلم کا بھاڑا۔ دو سو روپیہ مادو نے کہا ٹھیک ہے۔ اس نے پیسے اسے دے دیے، وہ شخص اندھیری سیڑھیوں سے اوپر کے کمرے میں لے گیا جہاں بالکل اندھیرا تھا۔ اس نے ماچس سے دیا جلایا اور دیے کو نیلم کے چہرے کے قریب لے گیا۔ حضور دیکھ لو، قندھاری انار ہے۔ مادو ایک عجیب سحر میں ہونقا رہ گیا۔ نیلم دیے کی روشنی میں جگمگا رہی تھی۔ اسے نیلم

بہت خوبصورت لگی۔ اس شخص نے پھر پوچھا صاحب مال پسند ہے۔ مادو نے ہاں میں جواب دیا اور وہ شخص وہاں سے چلا گیا۔ نیلم نے فوراً اپنے پیسوں کا مطالبہ کیا تو جھجکتے ہوئے مادو نے اور پیسے نکال کے نیلم کو دے دیے۔ مادو نے اپنی قمیض اتارتے ہوئے کہا ''نیلم بہن کپڑے اتارو۔'' نیلم کو کچھ سمجھ نہیں آیا' پوچھا ''کیا کہا تم نے؟'' مادو نے پھر کہا ''نیلم بہن کپڑے اتارو۔'' اب کی بار نیلم کو غصہ آ گیا ''اے او بھڑوا! ہم کو بہن مت بولو۔ ہم پیشہ کرتا ہے۔ بے غیرت نہیں ہے''۔ نیلم نے پیسے مادو کے منہ پہ مارے اور اسے سیڑھیوں سے دھکا دیدیا۔ مادو لڑھکتا ہوا قمیض ہاتھ میں تھامے وہاں سے گھر واپس آ گیا۔ دادا کو کچھ نہیں بتایا اور اگلے روز ہی اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ سب گھر والے خوش تھے کہ مادو واپس آ گیا۔ سمجھ رہے تھے اب مادو ٹھیک ہو گیا ہے۔ رات کو سب کوٹھے کی چھت پر حسب معمول سو رہے تھے کہ رات کے وسط میں مادو کی ماں نے دیکھا کہ مادو پھر اسی دیوار پہ نیند میں چل رہا ہے۔ وہ بھاگ کے پھر اسے اتارنے گئی تو مادو نے کہا ''ماں میں اب نیند میں نہیں ہوں میں جاگ رہا ہوں۔''

وفا کی ننگی چڑیل

ٹلو نے زور سے چھینک ماری۔ اور ناک صاف کرنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ اور پورے زور سے پھیپھڑوں کی ساری ہوا ناک کی سرنگوں سے نکالنے کی کوشش کی لیکن سرنگ کھل نہ سکی اس کوشش میں ٹلو جتلا تھا کہ کستوری کی تیز خوشبو نے ناک کی سرنگ کو چھینک کے ساتھ کھول دیا۔ یا شکر الحمداللہ۔ اس نے دل میں پڑھی۔ لیکن شکر الحمداللہ کی آواز باہر آئی اور اس کے بند کان بھی کھل گئے۔ سر اٹھا کے دیکھا تو مولانا صاحب کلف سے اکڑی شلوار قمیض میں ایسے چل رہے تھے جیسے یمن کی زرہ بکتر میں سپہ سالار چل رہا ہو۔ شلوار قمیض کی اکڑن سے بار بار یہ خیال آ رہا تھا اگر یہ کلف کا لیپ ستر سال کا بوڑھا کرنا شروع کر دے تو شاید فائرز لیبارٹری کو ویاگرا کی لیب کو بند کرنا پڑے۔ واہ کیا نورانی چہرہ۔ کان میں سبز رنگ کا پھایا۔ پوری گلی کو مہکا رہا تھا۔ تیل سے چپڑی داڑھی آنکھ میں کجلے کی دھار۔ شاہانہ انداز سے ان کا چلنا۔ ٹلو بھی اٹھ کے مولانا صاحب کے پیچھے گنگناتا ہوا چلنے لگا۔ چال میں ٹھمکا، کان میں جھمکا، کمر پہ چوٹی لٹکے، ہو گیا دل کا پرزہ پرزہ، لگے پچاسی جھٹکے۔ پچاسی جھٹکے پر مولانا نے پیچھے مڑ کے غصے سے ٹلو کو دیکھا تو ٹلو نے گلی کے دوسرے

کنارے پر چلنا شروع کر دیا۔ مولانا صاحب تو مسجد میں چلے گئے لیکن ٹلو مسجد کے سامنے والے مکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا۔ جس کی دیوار پر لکھا تھا'' وہ دیکھو کتا پیشاب کر رہا ہے۔''

اسی اثنا میں ایک کتا گلی کے کناروں کو سونگھتا سونگھتا اسی مکان کے کونے کو سونگھنے لگا۔ کتے نے اپنی پچھلی ٹانگ ایسے اٹھائی جیسے نلکے کی ہتھی کو اوپر اٹھا کے پانی کے پریشر کو کھینچ کے پانی نکالنے والا تھا۔ ٹلو کے منہ سے بے اختیار نکل گیا'' وہ دیکھو کتا پیشاب کر رہا ہے۔''

ابھی کتا دیوار کے کینوس پر تجریدی آرٹ کا نمونہ مکمل کرنے والا تھا تو ٹلو نے اسے اپنی گود میں اٹھالیا اور واپس اسی تھڑے پر آ کے بیٹھ گیا۔ مولانا صاحب نے مسجد کے لاؤڈ سپیکر کو کھول کے مائیکروفون میں پہلے پھونک ماری اور پھر بڑی انگلی کے جوڑ سے ٹھک ٹھک کی۔ گلا صاف کیا اور پھر زور سے سپیکر میں کھانسے۔ تو ایسے لگا کاؤ بوائے فلموں میں جان وین نے ایک ہی گولی سے تین ریڈ انڈین کو مار دیا ہو۔

ٹلو کو لاؤڈ سپیکر سے آئی ہوئی آواز ناگوار گزری اور اسے ایک شرارت سوجھی۔

اس مسجد کے پچھواڑے جا کر بانس پر لگے لاؤڈ سپیکر کا منہ گھما کر دھوپ سڑی والے امام باڑے کی طرف کر دیا۔ بس پھر کیا تھا لاؤڈ سپیکر سے نکلی آواز جیسے سپر سانک جیٹ کی طرح امام بارگاہ کی دیواروں کو لگنے لگی۔ تو امام باڑہ کے ذاکر صاحب کلب عباس جو ماتم زنجیر کی تیاری میں اپنی تیز دھار زنجیروں کو تیز کر رہے تھے غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

انھوں نے بھی اپنے لاؤڈ سپیکروں کا رخ مسجد عثمانیہ کی سمت کر دیا۔ بس دونوں طرف سے لاؤڈ سپیکروں سے آوازیں ایسے نکل رہی تھیں جیسے ایف سولہ نے اپنے میزائل پھینکنے شروع کر دیے ہوں۔

اس تمام بمباری کی اطلاع جب دھوپ سڑی کی چوکی میں پہنچی تو شہر کے داروغہ

نے فوراً اپنا خطرے کا سائرن بجایا۔ تمام نفری فوراً الرٹ ہوئی اپنی بندوقیں اٹھائے امام باڑہ اور مسجد کے سامنے مورچے باندھ لیے۔ دونوں فریقوں کے سپیکروں کا رخ موڑ دیا گیا۔

اس سارے ہنگامے میں نلو بھی اپنے کتے کو اٹھا کر موقعہ واردات پے تفتیش کرنے پہنچا۔ پہلے امام باڑہ میں پہنچے تو ذاکر کلب عباس دروازے پر سیاہ لباس میں شلوار کے ازار بند سے بندھی کسی چیز کو بار بار ہاتھ لگا کر اپنے آپ کو مطمئن کر رہے تھے کہیں وہ بھاگ تو نہیں گئی۔ نلو قریب پہنچا اور کلب عباس کو دیکھ کر کہا

''نعرہ مار علی دے ناں دا۔'' کلب عباس نے زور سے جواب میں ''یا علی'' کہا۔ بڑے ادب سے سلام کر کے پوچھا ''قبلہ محترم ایک سوال بڑی دیر سے دماغ میں گھوم رہا ہے۔ اجازت ہو تو پوچھوں۔'' ''ہاں پنج تن پاک کے ماننے والے پوچھ۔'' ''آپ کا نام کلب عباس ہے اس کا مطلب کیا ہے۔'' ذاکر نے جوش میں آ کر جواب دیا۔ ''حسینؑ کے نام پر اپنے بچے قربان کروں۔ کلب عباس کا مطلب ہے عباس کا کتا۔'' فوراً نلو نے کتے کو اپنے سینے سے لگایا اور صلوات پڑھتا ہوا واپس مسجد عثمانیہ کے سامنے اسی تھڑے پے آ کے بیٹھ گیا۔

ظہر کی نماز ختم ہوئی۔ سب نمازی عبادت سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر نکلے۔ مولانا سب سے آخر میں نکلے تو۔ نلو نے کتے کو زمین پر چھوڑا اور آگے بڑھ کر مولانا صاحب کو جھک کر سلام کیا۔ مولانا صاحب نے بڑی شفقت اور محبت سے نلو کے سر پے ہاتھ پھیرا۔ ''برخوردار مسجد میں نظر نہیں آتے۔ نماز سب مسلمانوں پر فرض ہے۔'' نلو کو نماز کی نصیحت کی۔ ''روزے رکھا کرو۔'' اور شفقت سے سر پے ہاتھ پھیرا۔ ''جی حضور'' نلو بہت ہی مودبانہ انداز سے مولانا صاحب کی نصیحتوں کو سن رہا تھا۔ نلو نے بڑی انکساری سے مولانا صاحب سے پوچھا۔ ''جانوروں کے بارے میں کچھ بتائیں۔'' ''دیکھو برخوردار انسان اشرف

المخلوقات ہے۔لیکن جانوروں کے ساتھ ہمارے نبیؐ ،صحابہ کرام کو بہت انس تھا،محبت تھی۔
کتے اور گھوڑے تو بہت وفادار جانور ہیں۔ مجھے اگر اس محبت کا تھوڑا سا نذرانہ ملے تو میں
اپنی وفا کا حق ادا کروں۔میرے لیے فخر ہوگا۔اگر میں حضرت عمر کا کتا کہلاؤں۔''مولانا
نے قرآن کی ایک آیت پڑھی۔

مولانا ابھی گلی کی نکڑ سے مڑے ہی تھے کہ ٹلو نے کتے کو پھر اٹھالیا۔لگا اس سے
کھیلنے۔تین گلیوں سے گزر کر جب یوسف ٹھیکیدار کے لکڑیوں کے ٹال کے سامنے سے گزر
رہا تھا کہ ٹلو کی گود سے کتے نے لمبی چھلانگ لگائی۔یوسف ٹھیکیدار کے ٹال کے بڑے گیٹ
کے اندر بند سے ہوئے بولی کتے کو دیکھ کر غرانے لگا اور ایک چھلانگ سے اس پر جھپٹ پڑا
اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

ٹلو کو اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کتا اپنے مالک کا تو وفادار ہے مگر اپنی نسل کا
دشمن کیوں ہے؟

تکونی خواہش کی کالی دیوار

''کون ہے؟''

زرینہ کی ماں نے دروازے کے اندر منہ ڈال کر نیچے جاتی ہوئی سیڑھیوں میں آواز لگائی

''چلو اب تم نکل جاؤ۔''

زرینہ نے سہم کر ساد کے منہ پر ہاتھ رکھ کر گھبراتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ساد نے زرینہ کو سینے سے لگا کر بھینچا

''وعدہ کرو کل چھٹی کے بعد کمپنی باغ میں ضرور ملو گی''

''ہاں ہاں ضرور ملوں گی۔'' زرینہ نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ساد نے زرینہ کا ایک لمبا بوسہ لیا اور سر ماسٹر احمد دین صاحب کے دروازے سے باہر نکلا جو گلی میں کھلتا تھا۔

دائیں دیکھا تو گلی کی نکڑ پر ناظم درزی کی دکان کا ایک کاریگر جو ماسٹر صاحب کے گھر کے دروازے کو گھورے جا رہا تھا، نے جھٹ سے ناظم درزی کو اشارے سے کچھ بتایا۔ ساد

نے سر اندر کر لیا۔ اپنے کپڑوں کو درست کر کے خاموشی سے چوروں کی طرح باہر نکلا۔ ناظم درزی کے کاریگر نے اس کا کچھ گلیوں تک پیچھا کیا لیکن ساد بھی اپنے کالج کی ہاکی ٹیم کا کپتان تھا، یوں ڈاج دے کر ہمارے محلے کی حد سے پار ہوا جیسے گیند گول کی پول سے باہر نکلتی ہو۔

شام کو جب ماسٹر احمد دین گھر واپس لوٹ رہے تھے تو ناظم درزی نے راستہ روک لیا۔

''ماسٹر صاحب کیا وجہ ہے بہت دیر سے گھر لوٹتے ہیں آج کل؟''

''ہاں ناظم بیٹے، کیا کروں سکول کے بعد بچوں کو ٹیوشن پڑھانی ہوتی ہے، دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔''

''ماسٹر صاحب ذرا اپنے گھر کی دیواریں اونچی کر لیں۔ آپ کے آنگن کی بیری کے پتے ذرا گھر سے باہر نکلنے لگے ہیں۔'' ناظم درزی نے مکارانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا۔

''کیوں بجھارتیں ڈال رہے ہو، کھل کے بات کرو۔ تمہیں تو پتا ہے یہ دروازہ گلی میں کھلتا ہے اور ساتھ ہی سیڑھیاں ہیں۔ ہمارا نہ تو کوئی برآمدہ ہے، نہ ہی کوئی چیز ہے، گھر میں بس ہم سب، اوپر والے چوبارے پر رہتے ہیں۔''

ناظم درزی نے بڑے مودبانہ انداز میں جھک کر کہا

''ماسٹر جی آپ کی عزت سارا محلہ کرتا ہے۔ ہماری تو عزت اور احترام سے آپ کے سامنے آنکھ نہیں اٹھتی، لیکن آج کل ایک جوان لڑکے کی نگاہ گھر کے پار جاتی ہے''

ماسٹر جی جیسے زمین میں گڑتے جا رہے تھے۔

''محلہ بھمرانہ میں شیخ حشمت کا جوتیوں کا کارخانہ ہے۔ اس کا بیٹا ساد آج کل ہماری گلی کے بہت چکر کاٹ رہا ہے''۔

ماسٹر صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ بغیر کچھ کہے تیزی سے گھر روانہ ہوگئے۔ تھوڑی دیر میں شیروانی پہنے فوراً شیخ حشمت کے گھر روانہ ہوگئے۔ سارا ماجرا شیخ حشمت کے آگے کھول دیا۔ شیخ حشمت نے ہاتھ باندھ کے ماسٹر جی سے معافی مانگی۔ وعدہ کیا آیندہ ایسا ہوا تو میں اپنے بیٹے کو گولی مار دوں گا۔

شیخ حشمت نے ساد کی ایسی پٹائی کی کہ چھٹی کا دودھ ساتویں سیکنڈ میں یاد آ گیا۔ ساد نے کان پکڑ لیے، واقعی عشق وہ کھیل نہیں جو لونڈے ہاکی کے میدان میں کھیل سکیں۔ اُس نے بالکل تیر کی طرح سیدھا کالج اور شام کو والد صاحب کے ساتھ چمڑے کے جوتوں پر پیپرے کرنا شروع کر دیا۔

کچھ دن گزرے تو زرینہ کی یاد ستانے لگی لیکن مار کی تکلیف کا اندازہ، زرینہ کے خیال کو جسم کے تمام سوراخوں سے ہوا بن کے نکال دیتا، لیکن ہر روز کمپنی باغ کے فوارے پہ بیٹھ کر پانی کی بوندوں کو زرینہ کے بالوں کے موتیوں میں پروتا رہتا۔ فوارے سے نکلتا ہوا پانی یوں لگتا جیسے زرینہ سر کی جنبش سے بالوں کی چھتری کھولتی اور بند کرتی ہو۔ کمپنی باغ میں لگے سرو کے درخت اسے زرینہ کے قد کاٹھ کی یاد دلاتے۔ گیندے، چنبیلی اور موتیے کی خوشبو زرینہ کی آمد کی خوشخبری دیتی۔ تالاب میں ہچکولے کھاتا چاند کا عکس زرینہ کا چہرہ لگتا۔ بس ہر چیز میں اسے زرینہ نظر آتی تھی۔

ایک دن بس وہ انہی یادوں کے تانے بانے بُن رہا تھا کہ اسے زرینہ کمپنی باغ کے بڑے گیٹ سے باہر جاتی نظر آئی۔ فوراً اٹھا تو...... جسم کے سارے جوڑوں نے چیخ کر التجا کی، حضور اس دل کی وکٹوریہ 302 کی لگام کو قابو میں رکھو ورنہ ہم اس بار آپ کی ہڈیوں کو جڑا رہنے میں مدد نہ کر سکیں گے لیکن عشق تو گولائھ کی رتھ پہ سوار تھا۔ فوراً زرینہ کے پیچھے ہولیا۔ قریب پہنچ کر جوش سے بولا

"خدا کی قسم میں بے وفا نہیں ہوں"

زرینہ نے جب مڑ کے دیکھا تو ساد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا کیونکہ وہ زرینہ نہیں تھی، وہ تو ندیم تھا جسے پورا شہر نینا کے نام سے پکارتا تھا۔ بالکل زرینہ جیسا قد کاٹھ، اسی جیسی پتلی کمر، ویسا ہی جھلمل کرتا، چاند چہرہ، کپڑے تو مردانہ تھے لیکن اس کی تراش بالکل زنانہ تھی۔ قمیض چھاتیوں سے ذرا پھولی ہوئی تھی، کمر سے تنگ، قمیض کا جوڑ دو اطراف سے ایسا کھلا جس سے نینا کا جسم صاف چھپتا بھی نہیں، صاف نظر آتا بھی نہیں۔ کولہوں سے تنگ پانجامہ نما پتلون جو ٹخنوں سے ذرا کھلی، لمبی سی کشمیری شال جو بھائی خریدے اور بہن کے کام آسکے۔ جس سے نینا نے اپنی چھاتی کو ڈھانپنے کی بہانہ وار کوشش میں اپنے ہاتھ کو کلائی سے نوے درجے کے زاویئے سے صرف دو انگلیوں کو عین سینے کے وسط میں ایسا رکھا جو ہمیشہ نینا کی کمر کمان بنتی، اور ہلکا سا سینہ باہر نکلتا تو ہاتھ ہمیشہ ہلتا رہتا۔ نینا کے ہلکی سی سرخی لگے ہونٹوں نے جب جنبش دی تو ساد کا دل بالکل اسی مچھلی کی طرح سانس لینے لگا جیسے مچھلی پانی سے باہر ہوا کو پوری جدوجہد کے ساتھ آبِ حیات سمجھ کر پورا منہ کھولتی ہے اور اسے اپنے پھیپھڑے میں بھر کر پھولتی اور سکڑتی ہے۔

''خدا کی قسم آزماؤ تو سہی، گردن کٹوا لیں گے لیکن بے وفائی کا الزام گردن پہ نہ آنے دیں گے۔'' ساد کو یوں لگا جیسے عشق کے جولیس سیزر نے قلوپطرہ پر سارا مصر نچھاور کر دیا ہو یا حضرت یوسف کو زلیخا نے خرید لیا ہو۔

پتا نہیں ساد کی جذباتی ضرورت تھی یا واقعی اسے نینا میں ساری کائنات سمٹی نظر آئی، نینا کے دو بول اس پر اس ویکسین کی طرح اثر انداز ہوئے جیسے اس کی محبت کو مارنے والے وائرس اس کے جسم کو ختم کر رہے ہوں۔ ایک لمحے کے لیے وہ بالکل بھول گیا کہ نینا کے جسم کے وسط میں وہ علامت جو اسے مرد یا عورت ہونے کی اجازت دیتی ہے وہ موجود بھی ہے یا نہیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ نینا کے نینوں میں ڈوب جانے میں زندگی ہے۔ جب خیالوں سے باہر نکل کر سر کو جھٹکا دیا اور خدا کا شکر ادا کیا یہ زرینہ نہیں ہے جسے ملنے کے

لیے اپنی ہڈیوں کے سرے کا نذرانہ ابا حضور کو پیش کرنا پڑے۔ ساد کی جان میں جان آئی۔ دونوں ایک ہی لمحے میں گھل مل گئے جیسے ان کی پہچان پچھلے سات برسوں سے ہو۔ دونوں باغ پے لگی بنچ پر بڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ کمپنی باغ کی گزرگاہ پہ رینگتی ہوئی کلفی کی ریڑھی نے نینا کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی قلفی کھاؤ گے۔ نینا نے پوچھا۔ میں لے آتا ہوں۔ ساد نے اٹھنے کی کوشش کی نینا نے اسے منع کر دیا۔ اس شہر میں نینا کا حکم چلتا ہے۔ نینا نے زور سے آواز لگائی بولیں کلفیوں کا فالودہ دو پلیٹوں میں حاضر کرے۔ اس نے فالودہ پیش کر دیا، ساد حیران رہ گیا کہ جس مودبانہ انداز میں فالودہ اس نے پیش کیا اور پیسے لینے سے بھی انکار کر دیا۔

نینا نے ساد کو بڑے پیار سے دیکھا۔ کمشنر سے لیکر پٹواری درونغہ، حوالدار کسی سے کوئی کام ہو، نینا کو یاد کرنا۔ وہ دونوں خاصا وقت ساتھ گزارنے کے بعد کل ملنے کے وعدے کے ساتھ جدا ہوئے۔ تمام رات ساد کو نینا کے خیالوں نے نیند سے جدا رکھا جیسے اس کے نینوں میں نینا بس گیا ہو۔

دوسرے دن دونوں شہر کے اکلوتے ائرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ سٹارلائٹ میں گھنٹوں بیٹھے رہے۔ اس دفعہ بھی ریسٹورنٹ کے بیرے نے نینا سے پیسے نہیں لیے بلکہ مالک خود نینا کا شکریہ ادا کرنے آیا۔ ریسٹورنٹ کے مالک کے بے تکلفانہ مکالمے ساد کو ناگوار گزرے ''آپ آتے ہیں تو سٹارلائٹ کے تاروں میں روشنی آتی ہے۔ آیا کرو کہ گلشن کا کاروبار چلتا رہے'' وغیرہ وغیرہ۔ ساد تھوڑا سا حسد محسوس کرنے لگا۔ ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو شہر کے ایک رئیس آدمی نے اپنی کار میں چھوڑ آنے کی پیشکش کی جو ساد نے رد کر دی۔ ساد نے نینا کو کہا'' آپ جانا چاہیں تو جائیں، میرے پاس تو سائیکل بھی نہیں جو تمہیں سواری کے لیے پیش کر سکوں۔'' نینا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور بھرائی ہوائی آواز میں کہا'' تجھ پہ ساری کائنات قربان کر دوں۔''

تمام راستے وہ نینا کے بارے میں سوچتا رہا لیکن اسے نینا کا لوگوں سے ملنا اچھا نہیں لگا تھا۔ ان سب لوگوں کو کیا دیتا ہے جو اس کی اتنی قدر کرتے ہیں۔ کیا ان کی یہ جنسی ضرورت پوری کرتا ہے۔ میں تو زرینہ سے مل نہیں سکتا شاید اسی لیے مجھے اچھا لگتا ہے۔ شاید زرینہ کا نعم البدل ہے یہ یا یہ ان سب امیروں اور باوسائل لوگوں کو وہ کچھ دیتا ہے جو ان کی بیویاں نہیں دے سکتیں۔ ساد کو یہ سب کچھ سوچ کر نینا سے گھن آنے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ شاید تمہیں نینا سے محبت ہوگئی ہے اور حسد کی آگ تمہیں اس طرح سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔ انہی سوچوں میں گم ساد چلا جا رہا تھا۔ دور سے اس نے بسنتا بدمعاش کو اپنی حاملہ بیوی کے ساتھ آتے دیکھا۔ بسنتا بدمعاش ساد کو بالکل نہیں بھاتا تھا۔ ایک تو اس کا ذریعہ معاش بد تھا، دوسرا زبان کا بہت غلیظ تھا۔ شراب بیچنے سے لے کر جوئے اور منشیات کا کاروبار تک کرتا تھا۔ پورے شہر میں اسی لیے مشہور تھا۔ اس نے ایک مرتبہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں گھس کر خنجر اس کی میز میں گھونپا اور پستول کے لائسنس کی زبردستی ڈیمانڈ کی۔ اس وقت تو ڈپٹی کمشنر نے ڈر کر ہاں کر دی لیکن بعد میں پولیس نے اتنی پٹائی کی کہ اس کی ایک ٹانگ توڑ دی۔ اس واقعہ نے اس کی دہشت پورے شہر میں ڈال دی۔

بسنتا بدمعاش لنگڑاتا ہوا اپنی حاملہ بیوی کے ساتھ ریل بازار سے یوں گزر رہا تھا جیسے پرنس چارلس اپنی حاملہ بیوی لیڈی ڈیانا کے ساتھ ایلنس سٹریٹ سے گوروں کی داد لیتا ہوا گزر رہا ہو۔ تمام دکاندار اسے جھک جھک کر سلام کر رہے تھے۔ کوئی پان پیش کرتا، تانگے والے سواری کی دعوت دیتے۔ ساد نے بسنتا بدمعاش اور نینا میں تھوڑی سی مماثلت پائی، فرق اتنا تھا کہ نینا سے اسے پیار تھا اور بسنتا سے نفرت، لیکن ایک چیز دونوں میں مشترک بھی، دونوں کی عزت بہت تھی۔ اسی سوچ میں وہ گھر پہنچا۔ خیالوں کو جھٹک دیا۔ نینا تو پیار بانٹتا ہے، اس لیے لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔ بسنتا بدمعاش کیونکہ تین قتل کر چکا ہے اس لیے سب لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ اسے عزت دیتے ہیں لیکن ڈپٹی کمشنر، پولیس کے بڑے افسروں اور امراء سے بھی تو پورا شہر ڈرتا ہے۔ ساد نے طاقتور لوگوں کو ایک زمرے میں ڈالا۔ نینا کو پیار والے زمرے میں ڈالا۔ پتا نہیں نینا اپنی مرضی سے اس ناپسندیدگی کو جھیلتا

ہے یا اس شان و شوکت اور ہر دلعزیزی کو قائم رکھنے کی قیمت ادا کرتا ہے۔ وہ تمام رات نینا کے خیالوں میں گم رہا۔ اگلے دن کالج سے فارغ ہوتے ہی نینا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ایوب چوک پر پہنچا تو یہ دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا کہ بسنتا اور نینا دونوں اکٹھے جا رہے تھے۔ ساد غصے میں بے قابو ہو کر دونوں کے پیچھے ہو لیا۔ چھپتے چھپاتے دونوں کا پیچھا کرتے ہوئے گلی کی نکڑ پر کھڑا ہو کر دونوں کو دیکھنے لگا۔

بسنتا نے اپنی بیٹھک کا دروازہ کھولا جہاں وہ اپنے ناجائز کاروبار کی خرید و فروخت کرتا تھا۔ دونوں کو اندر جاتے دیکھ کر اُس میں ایک طاقت سی آ گئی۔ ڈرے بغیر بیٹھک کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ حقیقت کی جانکاری کے لیے وہ بلی کی طرح دلیر ہو گیا، چاہے بلی کی جان حقیقت کی جانکاری کے لیے چلی جائے۔ بیٹھک سے لگا ساتھ والا پلاٹ بالکل خالی پڑا تھا۔ خالی پلاٹ میں گندگی کے ڈھیر پر چڑھ کر وہ بیٹھک کی پچھلی طرف کود گیا۔ وہاں پڑی ٹوٹی چارپائی کو دیوار کے ساتھ لگا کر بند کھڑکی کے اوپر والے روشندان سے اندر جھانکا تو عجیب و غریب منظر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

بسنتا بدمعاش جس کی دہشت سے پورا شہر کانپتا تھا، جو زندگی کا ہر خطرہ مول لے کر ناجائز کاروبار کرتا تھا، جس کا ذریعہ معاش پیسے لیکر زبردستی مکان خالی کروانا تھا، لوگوں کی جانیں لینے سے بھی گریز نہ کرنے والا، عورتوں والے کپڑے پہن رہا تھا۔ ساد کو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ غور سے دیکھا تو واقعی بسنتا بدمعاش میک اپ سے اپنے بڈھے اور بدصورت چہرے پر لپ سٹک اور کاجل سے نشیلی آنکھیں بنا کر عورتوں کی نسوانی تبدیلی کی کوشش کر رہا تھا۔ بسنتا بدمعاش سج دھج کے دلہن بنا ولایتی فوم کے پلنگ پر گھونگھٹ نکال کر بیٹھ گیا اور نینا نے آہستہ آہستہ اس کا گھونگھٹ اٹھانا شروع کر دیا۔

نینا کے اندر چھپے مرد کو دیکھ کر وہ سب معاملہ سمجھ گیا۔ وہ عجیب سی کیفیت میں گھر واپس جاتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ شہر کے سب طاقتور افسروں اور امراء کا یہ دولہا گھونگھٹ اٹھاتا ہے۔

☆☆☆

میلی جنّت

ایک شور اٹھا۔ سب نے مڑ کے دیکھا۔۔۔ پھر سب نے اپنے سر قبلے کی طرف کر لیے۔ اگلی صف کے نمازی نے پوچھا "کیا ہوا۔۔۔؟" کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔ دوسرے صف کے نمازی نے منہ پھیر کر پچھلی صف کے نمازی سے سر اوپر کی طرف ہلا کر۔۔۔ ہاتھ کو گول گھما کر اشارے سے پوچھا۔۔۔ "کیا ہوا۔۔۔" ساتھ والا نمازی درود شریف پڑھ رہا تھا۔ کچھ نہ بولا۔۔۔ صرف اپنی ٹھوڑی کو تھوڑا سا آگے نکال کر ہونٹوں کے کونے کو پیچھے کھینچ کر سر نفی میں ہلایا۔۔۔

تیسرے صف کا نمازی ان کے تجسس کی تسکین کے لیے۔۔۔ زور سے بولا۔۔۔ "ملک خورشید کے بیٹے فرمان ملک کا اطالوی جوتا چوری ہو گیا"۔۔۔ تین نمازی سرگوشی سے بڑبڑائے۔۔۔ "کیا زمانہ آ گیا ہے۔۔ خدا کے گھر میں بھی چوری سے باز نہیں آتے۔" پھر اس نے دیکھا۔۔۔ کیا دیکھا؟۔۔۔ ایک مسافر کی بس چھوٹ گئی۔۔۔ لاری اڈے کے بکنگ کلرک سے معلوم کیا۔۔۔ "اگلی بس کب جائے گی؟"۔۔۔ بکنگ کلرک نے جواب دیا۔۔۔ "کل چھ بجے"۔۔۔ "ہر روز چھ بجے"۔۔۔ "ہاں۔۔۔" "پر آج

کیوں جلدی چھوٹی؟''۔۔۔''بس بھرتی ہے۔۔۔تو چھوٹتی ہے۔۔۔آج جلدی بھر گئی۔۔۔جلدی چھوٹ گئی۔''

مسافر نے سوچا۔۔۔کیا سوچا؟۔۔۔رات مسجد میں گزار لوں گا۔۔۔کل مزدوری سے جلد ہی فارغ ہو کر چھ بجے سے پہلے لاری اڈے پہنچ جاؤں گا۔۔۔مسجد آیا تو دروازہ بند تھا۔۔۔کلاشن کوف بردار چوکیداروں سے پوچھا۔۔۔کیا پوچھا؟۔۔۔''خدا کے گھر میں کیا خطرہ۔۔۔یہاں تو اسلام کے دشمن کو بھی پناہ ملتی ہے''۔۔۔چوکیدار ہنسے۔۔۔''اب یہ سب سے زیادہ غیر محفوظ ہے۔ ہم تو سب نمازیوں کی تلاشی لیتے ہیں۔۔۔''

مسافر نے سوچا۔۔۔کیا سوچا۔۔۔خدا کے گھر میں خدا محفوظ نہیں۔۔۔مسافر خوش ہوا۔۔۔خدا میرے دل میں محفوظ ہے۔۔۔بہت سردی تھی۔۔۔کہرا بھی پڑا۔۔۔بجلی بھی کڑکی۔۔۔بادل بھی گرجے۔۔۔مسافر اقبال کے بلبل کی طرح تنہا اداس بیٹھا رہا۔۔۔ایک شور اٹھا۔۔۔

سب نے مڑ کے دیکھا۔۔۔پھر سب نے اپنے سر قبلے کی طرف کر لیے۔۔۔اگلی صف کے نمازی نے پوچھا''کیا ہوا؟''۔۔۔کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔دوسری صف کے نمازی نے منہ پھیر کر پچھلی صف کے نمازی سے سر اوپر کی طرف ہلا کر ہاتھ کو گول گھما کر اشارے سے پوچھا۔۔۔''کیا ہوا؟''۔۔۔ساتھ والا نمازی درود شریف پڑھ رہا تھا۔۔۔کچھ نہ بولا۔۔۔صرف اپنی ٹھوڑی کو تھوڑا سا آگے نکال ہونٹوں کے کونوں کو نیچے کھینچ کر نفی میں ہلایا۔۔۔تیسری صف کے نمازی نے ان کے تجسس کو تسلی دی اور زور سے بولا۔۔۔''ایک مسافر رات مسجد کے باہر ٹھٹھر کر مر گیا''۔۔۔تین نمازی سرگوشی میں بڑبڑائے۔۔۔''کیا زمانہ آ گیا۔۔۔مسجد میں بھوکوں کو کھانا۔۔۔مسافروں کو رات بسر کرنے کیلئے صفیں ملتی تھیں۔۔۔پانچ وقت گلی کے لوگ ایک دوسرے کو السلام علیکم

کہتے۔۔۔جمعہ کو بیٹے بیٹیوں کے رشتے کی بات چھیڑتے۔۔۔عید کو گلے ملتے۔۔۔اب ایک دوسرے کا گلہ کاٹتے ہیں۔۔۔"

پھر اس نے دیکھا۔۔۔کیا دیکھا؟۔۔۔مسجد کے اندر ایک لمبا نل۔۔۔نل کے دونوں طرف وضو کرنے کی ٹونیاں۔۔۔وضو والی ٹوٹیوں کے سامنے چار غسل خانے۔۔۔مسجد کے بڑے دروازے کے باہر چھ چھوٹے طہارت خانے۔۔۔بورڈ آویزاں۔۔۔کچھ لکھا تھا۔۔۔کیا لکھا تھا؟۔۔۔"اجابت منع ہے۔"

ایک شور اٹھا۔۔۔

سب نے مڑ کے دیکھا۔۔۔پھر سب نے اپنے سر قبلے کی طرف کر لیے۔۔۔اگلی صف کے نمازی نے پوچھا "کیا ہوا"۔۔۔کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔دوسری صف کے نمازی نے منہ پھیر کر پچھلی صف کے نمازی سے سر اوپر کی طرف ہلا کر ہاتھ کو گول گھما کر۔۔۔اشارے سے پوچھا۔۔۔"کیا ہوا؟"۔۔۔ساتھ والا نمازی درود شریف پڑھ رہا تھا۔۔۔کچھ نہ بولا۔۔۔صرف اپنی ٹھوڑی کو تھوڑا سا آگے نکال کر ہونٹوں کے کونوں کو نیچے کھینچ کر نفی میں سر ہلایا۔۔۔تیسرے صف کے نمازی نے ان کے تجسس کو تسلی دی۔اور زور سے بولا۔۔۔"کوئی طہارت خانے میں حالت اجابت میں پکڑا گیا"۔۔۔تین نمازی سرگوشی سے بڑبڑائے۔"کیا زمانہ آگیا ہے۔لوگ خدا کے پاک گھر کو بھی ناپاک کرنے میں گریز نہیں کرتے۔"

پھر اس نے دیکھا۔۔۔کیا دیکھا؟۔۔۔دو کمزور لاغر۔۔۔سولہ سولہ سال کے نوجوان۔۔۔دیر تک نماز پڑھنے کے بعد روتے رہے۔گڑگڑا کر خدا کو یاد کر رہے تھے۔ چہروں کی سرخی زرد رنگ نے لے لی تھی۔۔۔اس نے پوچھا۔۔۔کیا پوچھا؟۔۔۔"تم بھوکے ہو"۔۔۔"ہاں ہم بھوکے ہیں"۔۔۔اس نے کہا" آؤ تمہیں کھانا دوں"۔۔۔ دونوں نے نفی میں سر ہلایا۔۔۔پیٹ کی بھوک نہیں ہے۔۔۔کیا تمہیں روحانی بھوک

ہے۔۔۔دونوں نے بیک وقت ہاں کہی۔۔۔وہ تو صرف ایک منٹ میں مٹے گی۔دونوں مولوی صاحب کے پاس گئے۔مسجد کے مولوی نے بہت پیار کیا۔۔۔آؤ تمہیں جنت میں جانے کا راستہ دکھاؤں۔مولوی صاحب حکیم بھی تھے۔نماز سے فراغت کے بعد روحانی شفاخانہ تشریف لاؤ۔مولوی صاحب نے خطبہ دیا۔جوش سے چھوٹے چندے کے صندوق پہ ہاتھ مارا۔جنت میں گھر کی مارگیج کی قسط ادا کرو۔سب نے اپنی جیبیں خالی کر دیں۔

زرد نما چہرہ بردار روحانی دواخانہ گئے۔جھک گئے آداب کہا۔۔۔مودب ہو کے بیٹھ گئے۔بورڈ آویزاں تھا۔۔۔مریضوں کا علاج مفت۔زرد نما چہروں پر روحانی سرخی رینگی۔۔۔اور بھی جھک گئے۔مولوی صاحب کا روحانی دواخانہ۔۔۔دواخانہ سے منسلک تہہ خانہ۔۔۔تہہ خانہ میں ایک لیبارٹری۔۔۔رنگ برنگے تیزاب شیشے کی صراحیوں میں ابل رہے تھے۔کمپیوٹر کی پلازما سکرینوں پر فارمولے اپنی جمع تفریق میں مصروف۔۔۔بائیں طرف۔۔۔سمال۔۔۔میڈیم لارج اور ایکسٹرا لارج خود کش جیکٹیں۔۔۔زردی نما ایکسٹرا لارج خود کش جیکٹیں۔۔۔زردی نما لکڑی کے مجسموں پر ایسے آویزاں جیسے امریکی طرز کے ڈیپارٹمنٹل سٹوروں پر فیشن ایبل کپڑے ملبوس۔۔۔دو بہت بڑی جدید تکنیکی آلات سے مرصع کرسیاں۔دونوں کو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ۔۔۔چمڑے کی پیٹیوں سے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔پھر اس نے دیکھا۔۔۔کیا دیکھا؟۔۔۔مولوی صاحب نے دونوں کے سروں میں چھوٹا سا چپ لگایا۔جن کا کنکشن ایک ریموٹ کنٹرول سے تھا۔۔۔دونوں کی ہر حرکت مولوی صاحب کے ہاتھ میں تھی۔۔۔بٹن دبایا۔۔ایک دم جسم متحرک ہوئے۔سمال سائز کی جیکٹیں پہن لیں۔

ایک شور اٹھا۔۔۔اگلی صف کے نمازی نے کچھ نہیں پوچھا۔لیکن مسجد کے وضو والے نل کی ٹونٹیوں سے خون نکلا۔۔۔طہارت خانے میں پڑا ہوا فضلا ہڈیوں میں تبدیل۔۔۔رات گزارنے والے مسافر کی لاش سردی سے نہ ٹھٹھری۔۔۔بلکہ بارود سے

جھلس گئی۔۔۔ماں اپنے ادھ مرے بچے کو روحانی دواخانہ میں لائی۔۔۔ماں دھاڑی۔۔۔میرے بچے کو بچاؤ۔۔۔بچے کا سینہ پھٹا ہوا۔۔۔اس نے دیکھا۔۔۔اس دفعہ کچھ نہیں دیکھا۔۔۔صرف سنا۔۔۔کیا سنا؟ یہ روحانی نہیں۔۔۔شیطانی ہے شیطانی۔۔۔مولوی صاحب کی ماں کو تسلی۔۔۔روتی کیوں ہو۔۔۔تم تو شہید کی ماں ہو۔۔۔شہید تو زندہ ہیں۔۔۔وہ جنت میں پہنچ گئے ہیں۔۔۔

ماں کو فیض کے مریض کی طرح بے وجہ قرار آ گیا۔

اب کوئی شور نہیں اٹھتا۔۔۔

نمازی آرام سے نماز پڑھتے ہیں۔۔۔کسی سے کوئی سوال نہیں پوچھتا۔۔۔کوئی کسی کو کوئی جواب نہیں دیتا۔۔۔

مولوی حکیم صاحب کی نئی ایجاد۔۔۔کیا ایجاد؟ روحانی لیبارٹری میں ایک چپ کا تجربہ۔۔۔حکیم صاحب نے پالتو موٹے چوہے کے سر میں چپ لگایا۔ ریموٹ کنٹرول سے چپ کا بٹن دبایا۔ چوہے کے جسم کا درمیانی حصہ ہلا۔۔۔ارتعاش نے اس کو جنسی لذت دی۔ چوہے کی باچھیں کھلیں۔ چوہا خوش ہوا۔۔۔مولوی حکیم نے بیس دفعہ ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبایا۔۔۔بیس دفعہ چوہے کو جنسی لذت ملی۔

اس نے دیکھا۔۔۔کیا دیکھا؟۔۔۔حکیم صاحب نے دنیا کی تمام خوبصورت عورتوں کو چپ میں بھرا۔۔۔اور چپ کو اپنے سر میں خود لگا لیا۔

مولوی حکیم صاحب مسجد کی فصیل پر دونوں ریموٹ کنٹرول لیے ایسے کھڑے ہوئے جیسے دو جہانوں کے بادشاہ ہوں۔

عالم بالا کی جنت مخلوق خدا کے لیے۔۔۔اس دنیا کی جنت میرے لیے۔

☆☆☆

دو تہائی حرام

''بھپلے دیاں مسلمانیاں نے اج۔'' بھپلے کی ماں نے اپنی پڑوسن سے شیشے کا جگ مستعار لینے کی وجہ بتائی۔

''مسلمانیاں''...... پڑوسن نے جگ دیتے ہوئے حیرانی سے پوچھا...... ''آہو...... حقیقہ وی اے تے نال بچیویں سالگرہ اے...... ساڈے بھپلے دی اے پہلی دعوت اے...... ساڈا بھپلا چن ورگا اے...... ساڈا بھپلا دودھ وانگوں چِٹا اے...... تہانوں وی سدا اے۔''

''آہو آہو...... اسیں ضرور آواں گے...... پر کج پہلے تے دس دہندے''...... پڑوسن نے ذرا ناراضی سے جگ کو غور سے دیکھتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی تمہیں جگ چاہئے تھا اس لیے ہمیں دعوت دے دی۔

''لو تسیں تے گھر دے بندے او...... ہمسایہ ماں جایا...... نائی تھوڑا اگھلنا سی۔ ہائے میتوں تے بڑا ای کم اے۔''

بھپلا چن ورگا...... بھپلا بادام ورگا...... بھپلا دودھ ورگا...... گاتی ہوئی بھپلے کی ماں پڑوسن کے گھر سے روانہ ہوگئی۔ گھر میں بڑی چہل پہل تھی...... مہمان آ جا رہے تھے......

حلوے کی دیگ پک رہی تھی...... لاؤڈ سپیکر کے شور نے گہما گہمی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ لاؤڈ سپیکر والا ایک روپے کے نذرانے کے ساتھ...... مہمانوں کے نام کا اعلان کرتا ان کی پسند کا گانا لگا دیتا۔ اس سب شور شرابے میں بھپلے کا بھائی ماکھا بالکل چپ گم صم ایک طرف کھڑا سوچ رہا تھا۔ میرے اعزاز میں تو آج تک نہ کوئی دعوت ہوئی...... نہ کوئی عقیقہ...... مجھے یاد بھی نہیں میری ختنہ کب ہوئی تھی...... ہوئیں بھی تھیں یا نہیں...... لیکن بھپلے کے لیے بڑا اہتمام ہو رہا ہے۔ لیکن جب اس کی ماں پاس سے یہ گاتی ہوئی گزری...... بھپلا چن ورگا...... بھپلا بادام ورگا...... میرا بھپلا سنتوش کمار...... تو وہ سب کچھ بھول گیا...... چلو کوئی نہیں بھپلا میرا چھوٹا بھائی ہے اور میں اس سے سات سال بڑا بھی تو ہوں...... پھر دعوت کے کاموں میں مشغول ہو گیا...... لیکن جب پھر بھپلے کو ریشمی بستر پہ تین گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے گلابی رنگ کی تہبند باندھے دیکھا تو اسے پھر بھپلے سے حسد ہونے لگی۔ کیونکہ سب مہمان اسے پیسے دے رہے تھے...... اور ماسٹر صاحب پاس بیٹھے سب کے پیسے حساب کتاب کی کاپی میں لکھ رہے تھے...... لیکن پھر یہ سوچ کر جب نائی آ کر لال چڑیا اڑائے گا...... پھر بھپلے کو پتا چل جائے گا...... بیٹھا ہے بڑا شاہ سلامت بنا...... ماکھے کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی...... خالہ زاد بہن بار بار اپنی فرمائش پر یہ گانا سن رہی تھی...... ویساں دا رانجھا۔ امڑی دا پیارا، ویر میرا گھوڑی چڑیا...... بھپلا رنجیت سنگھ بنا لاتیں پسارے کیسے بیٹھا ہے...... پھر ماکھے کو ذرا سا غصہ آیا...... لیکن فوراً نورا نائی کی آمد نے ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کیا...... نورا نائی کی بڑی عزت تھی۔ کیونکہ سب کے رشتے وہ کرواتا۔ سب کی حجامتیں داڑھیاں وہ بناتا، سارے گاؤں کے پھنسی پھوڑے سے لے کے زنانہ و مردانہ پوشیدہ امراض کا علاج وہ کرتا۔ اسے پورے ملک کی سیاست پہ بھی خاصی دسترس تھی۔ اور ماکھے کی تو ہر دفعہ گرمی کے موسم میں یہ کہہ کر سر مونڈھ دیتا کہ لڑکے کے سر کو گرمی بہت چڑھی ہوتی ہے۔ گو نورا نائی کی اہمیت ذیلدار سے تھوڑی سی کم لیکن پٹواری سے زیادہ تھی۔ لیکن جب کسی

کی ختنہ کا وقت آتا تو اس کی اہمیت سب سے زیادہ بڑھ جاتی۔ کیونکہ اس کے بیٹے دیگیں پکانے کا کام بھی کرتے تھے۔ لہذا پورے گاؤں کا کوئی تہوار، کوئی شادی، کوئی غمی نورا نائی کی شمولیت کے بغیر ممکن نہ تھی۔ ان کا آنا تھا کہ سب مؤدب ہو کے اس کے آگے پیچھے گھومنے لگے۔ سب سے پہلے اس نے حلوے کی دیگ کو چکھتے چکھتے دو پلیٹیں ختم کر دیں۔ پھر لاؤڈ سپیکر سے بجنے والا دیساں دا راجہ بند کروایا۔ اور جب بھی وہ اپنی تقریر مائیکروفون پر کرتا تو مسجد کے مولوی صاحب ناراض ہو کر وہاں سے چلے جاتے۔ کیونکہ مولوی صاحب کے خیالات نورا نائی سے بالکل نہیں ملتے تھے۔ وہ ہمیشہ مسجد میں آنے والے نمازیوں سے کہتا کہ نورا نائی کے زبان کے ختنے ہونے بہت ضروری ہیں۔ نورا نائی نے ختنے کی اہمیت پر ایک لمبا لیکچر دیا۔

ختنے کے بغیر ہر چیز انسان پہ حرام ہے۔ اس کے بغیر کسی مسلمان کا قرآن حفظ کیا ہوا، خدا کو قبول نہیں ہے۔ بیوی آپ پہ حرام، بچے حرام ہیں۔ اور مسلمان ہونے کی سب سے بڑی گواہی یہی ہے۔ یہاں تک کہ ہر مرد حلال اس وقت تک نہیں ہوتا۔ جب تک اس کے ختنے نہ ہو جائیں۔ آخر میں نورا نائی نے دو چار قرآنی سورتیں پڑھیں عربی لہجہ بنانے کے لیے زبان کو پیچھے کھینچ کر گلے سے آواز نکالنے کی کوشش میں شہ رگ ہر لفظ پہ پھولتی اور سکڑتی۔ سب مرد ہاتھ باندھ کر مودب ہو کے سر جھکا لیتے۔ عورتیں دوپٹے سے سر ڈھانپ لیتیں، سب کے سب اتنے متاثر ہوتے جیسے وہ اس گاؤں کے مولوی سے بہت علم والا ہے۔ نورے نائی نے اپنی تقریر یہ کہتے ہوئے ختم کی۔ "طہارت نصف ایمان ہے یعنی پاکیزگی ایمان کا حصہ ہے اور ختنہ سے انسان ہر قسم کی ناپاکی سے پاک آسانی سے ہو سکتا ہے۔ حق زوجیت ادا کرنے کے لیے قدرتی بڑھتا ہے۔"

ماکھے نے پھر نظر اٹھا کے بھیلے کو دیکھا دبی آواز سے یہ نکلا ابھی تو حرام کا ہے۔

اس کی ماں جھوم جھوم کے گا رہی تھی۔ بھیلا چن ورگا...... بھیلا میرا بادام ورگا...... بھیلا میرا

دودھ دے گا......اج پورا مرد بنے گا......اج پورا مسلمان ہو جائے گا......اج پورا حلال بن جائے گا۔

پھر وہ لمحہ بھی آن پہنچا جو ہر مسلمان کے لیے سب سے اہم ہے۔ بھیلے کو اس کے ماموں نے ایک دری کے اوپر الٹی پرات کے اوپر بٹھا دیا۔ نورا نائی نے اس کے دونوں ہاتھ کو طے کیے ہوئے گھٹنوں کے درمیان ٹانگوں میں دبا دیے۔ بھیلا بالکل مینڈک کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ نورا نائی نے اپنے چمڑے کے بستے سے رنگ برنگی بوتلیں اور سفوف کی کئی پڑیاں نکالیں۔ جب نورا نے اپنا استرا نکالا تو بھیلا اپنا منہ بسورنے لگا اور رونے کے لیے منہ بگاڑنے ہی لگا تھا ماکھے کو اپنے چھوٹے بھائی پر بڑا ترس آیا۔ بڑے ہی پیار سے اس کی کمر پہ ہاتھ پھیرا اور نورا نائی نے سورت دل میں پڑھی اور اونچی زوردار آواز سے کلمہ ایسے پڑھا جیسے کسی نامسلم کو مسلمان بناتے ہوئے فخر اور جلال میں آتے ہوئے سچے مسلمان نے اپنی فتوحات کا جھنڈا گاڑ دیا ہو۔

اور بھیلا کو آسمان کی طرف اشارہ کیا، وہ دیکھ لال چڑیا۔ بھیلے نے آسمان کی طرف دیکھا۔ فوراً نورا نائی نے اپنے تیز دھار استرے سے اسے حلال بنا دیا۔ چاروں طرف سے مبارکبادوں کی آوازوں نے بھیلے کے رونے کی آواز کو دبا دیا۔ مبارک ہو۔ بھیلے کو حلال بنا دیا۔ لاؤڈ سپیکر پر پھر گانے بجنے لگے۔ شور وغل کا سماں پھر برپا ہو گیا۔ کھانے کی دریاں بچھ گئیں۔ مہمانوں نے جی بھر کے کھانا کھایا۔ بھیلے کی خوب خاطر تواضع ہو رہی تھی۔ اسے باداموں والا مصری کے ساتھ دودھ پلایا جا رہا تھا۔ نوٹوں کے ہار اس کے گلے میں پڑے تھے۔ شام کو سب مہمان چلے گئے۔ لیکن دور دراز سے آئے ہوئے رشتے دار وہیں ٹھہر گئے۔

دوسرے دن ماکھے کو اس کی ماں نے گاؤں کے چھوٹے سے بازار سے سودا سلف لانے کے لیے بھیج دیا تاکید کی مرغا کٹوا کر لانا۔ لہٰذا ماکھے نے سب سامان کی خریداری کے

بعد قصاب کی دکان سے ایک مرغ کا بھاؤ کر کے اسے حلال کرنے کو کہا۔ قصاب نے فوراً مرغے کی دونوں پروں کی قینچی ماری اور پروں کو اپنے پاؤں کے نیچے دبا لیا۔ تیز دھار سے چھرا نکالا تو ما کھا کو اپنا بھائی بھیلا یاد آ گیا۔ اسی طرح کل نائی نے اسے حلال بنایا تھا۔ مرغے نے بے بسی کے ساتھ اپنے پاؤں ہلانے شروع کر دیے۔ لیکن قصاب نے ایک ہاتھ سے مرغے کی گردن کی کھال کو کھینچا اور اونچی آواز سے کلمہ پڑھا۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ...... دوسرے ہاتھ سے تیز دھار چھرا اس کی گردن پہ پھیر دیا...... تڑپنے کے لیے دور پھینک دیا۔ ما کھا وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ دو گلیوں سے گزرتا ہوا باہر گنے کے کھیت کے کنارے کھڑا ہو کر، اپنی شلوار کے آزار بند کو کھولا، دوسرا ہاتھ دونوں ٹانگوں میں پیچھے سے گزار کر آزار بند پکڑ لیا۔ قمیص کے لٹکے ہوئے دامن کو اپنے دانتوں میں دبا کر زمین پر پیشاب کرنے کے بہانے بیٹھ گیا...... اور غور سے اپنے آپ کو دیکھنے لگا......

اسے حلال ہوتا ہوا مرغا نظر آنے لگا۔ یہ دیکھ کر خوش ہو گیا...... میں بھی حلال ہوں...... اور پیشاب کیے بغیر وہاں سے اٹھ آیا۔

قصاب کی دکان سے حلال مرغا اور باقی کا سودا سلف اٹھایا۔ بازار کی نکڑ پار کر کے دو چار گلیوں کے بعد بازار میں ایک دکان کے آگے ایک مچھیرن مچھلیاں بیچ رہی تھی۔ ما کھے نے سوچا مہمان آئے ہوئے ہیں ماں نے تو نہیں بتایا چلو ایک مچھلی ہی خرید لوں...... مچھیرن سے ایک مچھلی کا بھاؤ مکانے کے بعد کہا مچھلی کو حلال کر دو۔ مچھیرن یہ سن کر ہنسنے لگی...... اور ہنسی کو بمشکل روک کر...... بابو مچھلی کو تو اللہ تعالیٰ نے اوپر ہی سے حلال کر کے بھیجا ہے۔ ما کھے نے غور سے دیکھا تو مچھیرن کی گول گول آنکھیں مچھلی سے بہت ملتی تھیں۔ انہیں سوچوں میں گم تھا تو پیچھے سے لڑائی جھگڑے کے شور نے اسے اپنے خیالوں سے نکالا۔ پیچھے گھوم کے دیکھا تو گلی کی دوسری طرف اسی مچھیرن کا بھائی اپنی بیوی کو بری طرح پیٹ رہا تھا۔ ما کھا

مچھلی اور باقی سامان لے کر جھگڑے والی جگہ پہنچا تو مچھیرے نے زور سے ٹانگ اپنی بیوی کے پیٹ میں ماری۔ مچھیرے کی بیوی زمین پر تڑپنے لگی۔ جیسے مچھلی بن پانی تڑپتی ہے۔ سب لوگ کھڑے وہاں تماشا دیکھ رہے تھے۔ سب کے سب یہ کہہ کر دور ہاتھ باندھے کھڑے تھے کہ بھائی صاحب میاں بیوی کا معاملہ ہے کوئی اس میں دخل نہ دے۔ مچھیرن کے منہ سے خون نکل رہا تھا اور وہ درد سے کراہ رہی تھی۔ اس کی پھٹی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ ماکھے نے ٹوکری میں پڑی مچھلی کو دیکھا اس کی پھٹی آنکھیں بھی کچھ کہہ رہی تھی۔ اس نے مچھلی کو ٹوکری سے باہر نکال لیا اور اس پہ پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ ہاتھ رینگتا ہوا...... مچھلی کی آنکھوں سے نیچے گردن سے تھوڑا سا پہلے اسے کچھ محسوس ہوا۔ اس نے غور سے مچھلی کی گردن کو دائیں طرف سے دیکھا تو وہ قدرتی طور پہ آدھی کٹی ہوئی تھی۔ پھر بائیں طرف دیکھا تو وہاں سے بھی آدھی کٹی ہوئی تھی۔ اس نے مچھلی کو تڑپتی ہوئی مچھیرن کے پاس رکھ دیا۔ پھر وہ دوسری مچھیرن کی طرف گیا جس سے اس نے مچھلی خریدی تھی اور وہاں سے مچھلی صاف کرنے والی گول سی چھری اٹھائی...... اور مچھیرا جو اپنی بیوی کو پیٹ رہا تھا...... اسے دیتے ہوئے کہا۔

جو کام اوپر والا پورا نہیں کر سکا اسے تم پورا کر دو......
یہ آدھی حلال ہے۔ اسے پوری طرح حلال کرو۔ پڑھو
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

☆☆☆

حاملہ موت

ہندوستان کے بٹوارے اور اس کے جھگڑوں میں ملک کے مختلف حصوں میں اس طرف کے لوگ ادھر آ کر آباد ہو گئے۔ انہیں اس حصے کے مقامی لوگوں نے آبادکار کہنا شروع کر دیا۔ اسی سلسلے میں ایک ٹرین پانی پت سے اس حصے کے جنوب کے وسط ایک چھوٹے سے سٹیشن پر آ کے رکی تو پانی پت سے آئے ہوئے تمام مہاجروں نے اسی سٹیشن والے شہر میں پڑاؤ ڈال لیا۔ وہیں بس گئے۔ جمال بھی انہیں آبادکاروں میں سے ایک تھا۔ ماں باپ تو بٹوارے کے جھگڑوں میں مارے گئے تھے، خود بھی مٹی کے ڈھیلے کی طرح لڑھکتا موضع باغ میں آ کے بس گیا اور گنے کے کھیتوں میں کام کرتا کرتا جوان ہو گیا۔ جب موضع باغ کے ساتھ شوگر مل کا قیام ہوا تو گنے کے کھیتوں سے کاشتکار کو گڑ نکالنے پر پابندی لگنے کے بعد جمال کو بھی شوگر مل میں کام کرنا پڑا۔ وہ گنے سے لدے ٹرکوں کی قطاریں درست کرواتا۔ گنے کے گٹھوں کو باندھ کر اندر فیکٹری میں پہنچانے کا کام کرتا۔ بس زندگی تنہا گزار رہا تھا، نہ بیوی نہ بچے بس دور پار کے رشتہ دار شہر کے مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے جن کے ساتھ تعلق بہت کم تھا۔ بس اپنے دوستوں کو ہی اپنا رشتہ دار سمجھتا۔ ہر دوست کا خیال رکھتا۔

ایک دن کام سے فراغت کے بعد گھر آیا۔ پیٹ میں کچھ درد سا محسوس کیا اور خود ہی تشخیص کر لی کہ پرسوں باسی بینگن کا بھرتہ جو کھایا تھا اسی وجہ سے درد ہو رہا ہے اور تہیہ کر لیا کہ آیندہ تازہ کھانا بناؤں گا اور کھا کے ہنڈیا دھو کرالٹی مار کے رکھ دوں گا۔ لیکن تکلیف نے چین نہ لینے دیا تو سوڈا واٹر والی دکان پر کھاری سوڈے والی بوتل پینے چلا گیا تو دکاندار نے مشورہ دیا کہ بھائی یہ ولایتی سوڈا پینے سے جلد آرام آئے گا، سیون اپ (سیون اپ) کا کچھ سواد ہی اور ہے۔ جمال دکاندار کی باتوں میں بالکل نہیں آیا اور یہ کہہ کر انکار کر دیا بھائی سیون اپ ''عورتوں'' کے لیے یا شہر کے مردوں کے نازک معدے پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ ہمارے پتھر اور لکڑ کے معدے میں صرف یہ بنٹے والی بوتل ہی کام دکھائے گی۔ جمال نے بنٹے والی بوتل کے منہ میں انگوٹھے کو ٹھونسا، دوسرے ہاتھ کے مکے سے چھوں کرتی ہوئی بوتل کو کھولا تو دکاندار کو کہا دیکھا اس میں سے جو بلبلے اٹھ رہے ہیں یہ میرے اندر جا کر باسی بینگنوں کے بھرتے کا بھی بھرتا نکال دیں گے اور کالے نمک کی چٹکی گلاس میں ڈال کر گھٹ گھٹ کر کے پی گیا لیکن تمام رات درد میں کمی نہ آئی تو اپنے آپ کو تسلی دے کر سو گیا کہ صبح کام پر جانے سے پہلے حکیم صاحب سے ہوتا جاؤں گا۔ رات کو تکلیف میں افاقہ نہ ہوا تو رات کو جاگنے والے چوکیدار کے پاس چلا گیا۔ اسے بھی رات کو جاگنے کے لیے ساتھی مل گیا۔ اس نے مشورہ دیا ابھی پاتھیوں کی آگ پر گڑ رکھ کے رسے والے دیسی تمباکو کا حقہ پلاتا ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جب بھی میرے پیٹ میں گولہ سا اٹھتا ہے تو اس حقے کی کیا بات ہے۔ دونوں ساری رات حقے کے کش لگاتے رہے اور رات کو جمال وہیں چوکیدار کی چارپائی پر ہی سو گیا۔ صبح نور فجر کے وقت مرغ کی بانگ سے پہلے ہی پیٹ کے درد نے اسے جگا دیا تو سیدھا پو پھوٹتے ہی حکیم صاحب کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ حکیم صاحب نے اسے لٹا کر اپنی انگلیاں پیٹ میں یوں گھسائیں جیسے آٹا گوندھنے کے بعد آٹے کا پیڑا روٹی بنانے کے لیے نکالتے ہیں۔ حکیم صاحب فوراً اندر چلے گئے اور ایک پھکی پانی کے گلاس کے ساتھ اُسے پلا دی اور

اسے اندر ساتھ چولھے پر لے گئے جہاں حکیم صاحب کی بیگم نے ابھی ناشتے کے لیے چولہا گرم نہیں کیا تھا۔ وہیں پیڑھی پر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب نے بڑے پیار سے جمال کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر پیار سے کمر سہلانے لگے۔ حکیم صاحب نے اسے خبر سنائی کہ جمال تمہارے پیٹ میں جڑوں والا پھوڑا ہے۔ میں نے پیٹ میں غدود کو محسوس کر لیا ہے اور جمال کو اور پیار کرنے لگا۔ جمال کو یوں لگا جیسے کوئی چھرا گھونپنے کے بعد اسے چوم رہا ہو۔ حکیم صاحب نے فوراً مشورہ دیا کہ ابھی ہسپتال چلے جاؤ۔ جمال کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ دل ہی دل میں حکیم صاحب کی کم علمی پر شک کرنے لگا۔ اتنا بڑا حکیم ہوتا تو خمیرہ گاؤزبان اور جوشاندہ کی ڈبیوں پر حکیم اجمل کی سربند دواؤں کی جگہ اس کا نام نہ ہوتا۔ خود کو کچھ پتا نہیں ہے تبھی ہسپتال کا راستہ دکھا رہا ہے۔ میں کوئی امیر کبیر تھوڑا ہی ہوں جو تیتر بٹیرے اور مرغ میرے معدے میں جا کر اپنا گھونسلہ بنا لیں۔ پیٹ میں غدود ہے۔ اب ٹینڈے اور ساگ کھانے سے بھی بھلا غدود بنتا ہے۔ میں ساری عمر گنے کے بیلنے پر کام کرنے والا ہوں۔ گنے کے رس نے کبھی قبض تو ہونے نہیں دی۔ جمال کو حکیم کی تشخیص پر یقین تو نہیں آ رہا تھا لیکن اندر سے ڈر ضرور گیا تھا البتہ اِل میں جا کر فورمین کو بیماری کی درخواست دے کر شہر والے ہسپتال میں چلا گیا۔ بیرونی مریضوں والے وارڈ میں میز کرسی پر بیٹھے کلرک بابو سے اپنے نام کی پرچی کٹوائی اور پوچھا ''کہاں جاؤں؟'' اس نے اشارے سے کہا ''وہاں بیٹھ جاؤ۔ جب تمہارا نام پکارا جائے تب آ جانا۔ دیکھا تو مریضوں کی بھیڑ لگی تھی۔ عورتیں مرد تکلیف سے کراہ رہے تھے لیکن جمال اپنے نام کی پرچی کو مضبوطی سے تھامے اپنی جگہ سے ہلا نہیں حتیٰ کہ پیشاب کرنے کے لیے بھی نہ اٹھا کہیں میری باری نکل گئی تو پھر اگلے دن کی دیہاڑی بھی ٹوٹ جائے گی۔ آخر کار شام کو بابو نے اعلان کر دیا کل آنا۔ جمال نے بابو سے بڑی منت سماجت کی لیکن کچھ شنوائی نہیں ہوئی۔ اسے خیال آیا کہ ایمرجنسی وارڈ میں لفٹ میں مریضوں کو اوپر نیچے لے جانے والا بابو مسیح اس کا سنگھی ہے تو اس کی سفارش سے اپنا کام

چل جائے گا۔ فوراً باغ مسیح کو جا کر ڈھونڈا۔ اس نے ملتے ہی اس سے شکایت کی کہ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ یہاں ہسپتال میں میری بڑی واقفیت ہے۔ بڑے ڈاکٹروں کو میں ولایتی شراب پرمٹ پر نکلوا کے دیتا ہوں۔ چھوٹے کارکنوں کو جعلی والی شراب ولایتی بوتلوں میں چائے کی پتی کے رنگ سے ملا کے بیچ دیتا ہوں۔ اپنا سکہ چلتا ہے۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک سب اپنے مرید ہیں۔ وہ رات کو باغ مسیح کے ہاں رک گیا۔ صبح ہوتے ہی باغ مسیح نے جنرل وارڈ کے سب سے بڑے ڈاکٹر سے جمال کو ملوا دیا۔ ڈاکٹر نے تشخیص کے لیے کچھ ٹیسٹ اور ایکسرے کے لیے کہا جو اسی دن باغ مسیح کی کرامات سے ہو گئے۔ جمال کو ہسپتال میں وزیر اعظم والا پروٹوکول مل رہا تھا۔ تمام ٹیسٹوں کے نتیجے آنے تک وہ باغ مسیح کے ہاں رک گیا اور خوش ہو رہا تھا۔ یار ہو تو باغ مسیح جیسا ہو، مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت۔ میری تو بیماریوں کا مسیحا تو باغ مسیح ہے۔

دوسرے دن جمال کی فائل انکالوجی ڈیپارٹمنٹ میں چلی گئی اور سپیشلسٹ نے جمال کو انگریزی میں اس کی بیماری کا بتایا جو اسے سمجھ نہ آئی تو ڈاکٹر صاحب نے اردو میں بتایا کہ تمہارے پیٹ میں کینسر ہے لیکن فکر نہ کرو، ہمارے پاس ہر قسم کے علاج کا بندوبست ہے۔ تم باغ مسیح کے دوست ہو، تمہارا سارا علاج مفت میں ہو جائے گا۔ جمال کو اسی وقت ہسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ کینسر کے جنرل وارڈ میں مریضوں کی لمبی قطاریں لوہے کے بستروں کی لگی تھیں۔ بہت مریض تھے۔ کئی مریض تو زمین پر بستر بچھائے لیٹے تھے لیکن جمال کو وارڈ کے آخر میں تین کمروں میں سے ایک کمرہ ایک مریض کے ساتھ مل گیا۔ اس کمرے کے مریضوں کا خاص خیال رکھا جاتا کیونکہ یہاں کے مریضوں کی قوتِ مدافعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کوئی بھی جراثیم مہلک بیماری کا سبب بن سکتا تھا لیکن جمال سمجھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ باغ مسیح کی وجہ سے یہ امتیازی سلوک ہو رہا ہے۔

اگلے ہی دن جمال کو آپریشن کے لیے آپریشن تھیٹر میں پہنچانے سے پہلے باغ

مسیح نے استرے اور ولایتی صابن کے ساتھ یہ نصیحت کی کہ جسم کی صفائی اور غیر ضروری بالوں کی صفائی ضروری ہے اور مریضوں والے لباس نے اسے ہمیشہ فکر میں لگائے رکھا۔ کمر پر بندھی ڈوری اگر کھل گئی تو جسم ننگا نہ ہو جائے۔ حفاظت کے لیے اس نے ایک لمبا سا جانگیا پہن لیا جس نے اسے سکون بخش دیا۔ بدھ کے دن اس کا آپریشن تھا۔ دل کو تسلی خود ہی دے رہا تھا۔ بدھ تو تیرا مبارک دن ہوتا ہے کیونکہ بدھ کو سب کام سدھ ہو جاتے ہیں۔ اصل ڈاکٹر سے پہلے ایک اور ڈاکٹر نے اس کی فائل کو پڑھا اور اسے نشے کا ٹیکہ لگا دیا تو جمال کو یوں لگا کہ جیسے وہ آپریشن تھیٹر میں بیہوش ہو کر کسی اور تھیٹر میں پہنچ گیا ہے۔ بڑے بڑے ستونوں والے کمرے میں بادل، تارے اور چاند گھوم رہے ہیں۔ ایک سفید باریش بزرگ اور نیزہ تھامے بدنما شکل والا ننگا کھر جنجال کھڑا اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ کھر جنجال نے نیزے سے اس کا پیٹ پھاڑ کر جڑوں والا غدود نکال کے فرش پر رکھ دیا اور دونوں اس کا مشاہدہ کرنے لگے۔ باریش بزرگ نے کہا دیکھو گناہوں کا یہ لوتھڑا اس کے جسم سے نکل گیا ہے۔ بس کھر جنجال اپنی کالی سلیٹ پر کچھ نمبر لکھتا اور مٹاتا۔ باریش بزرگ بھی اپنی سونے کی پلیٹ پر کچھ نمبر لگاتا۔ دونوں نے آپس میں نمبر ملائے تو کھر جنجال غصے میں بڑبڑاتا وہاں سے چلا گیا۔ باریش بزرگ نے پیار سے جمال کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے کہا جا واپس چلا جا۔ دوسرے دن آنکھ کھلی تو ایک سفید کپڑوں میں حور اس کے لبوں میں شہد اور دودھ کے تیجے انڈیل رہی ہے۔ جمال نے باریش بزرگ کا بڑا شکریہ ادا کیا۔ شاید میری خزاں بھری زندگی میں مسکراتی بہار اس حور کے ساتھ بخش دی ہے۔ آنکھ کھلی تو پتہ چلا کہ نرس شہد کے تیجے کی بجائے تھرمامیٹر آرام سے منہ سے کھینچ رہی ہے۔ کھلی آنکھ دیکھ کے مبارکباد دی'' جمال آپریشن کامیاب رہا ہے۔''

جمال خوش ہوا کہ کچھ ہی دنوں میں، میں موشنع باغ کے باغوں میں چوکڑیاں بھرتا پھروں گا۔ جب نرس نے ڈریسنگ کے لیے زخم کی پٹی کھولی تو ایک لمبے سے چیر میں بے ہنگم

سلائی یوں ہوئی تھی جیسے گائے کا دودھ لینے کے بعد مردہ بچھڑے کی کھال میں بھوسا بھر کے سوئے سے پرو دیتے ہیں۔ خیالوں میں اپنے آپ کو خوش کر لیا کہ باغ مسیح کی واقفیت سے ہسپتال والوں سے بکرے کے قیمے کی فرمائش کر دوں گا اور جلد ہی زخم بھر جائے گا۔ جمال نے بکرے کے قیمے کی فرمائش بڑے ڈاکٹر کو نہیں کی، کیا سمجھے گا جمال کتنا ندیدہ ہے لیکن باغ مسیح اس کے لیے دو وقت کا کھانا گھر سے لاتا۔ صبح کا ناشتہ وہ ہسپتال والوں کا کھا لیتا۔ باغ مسیح نے جمال کو تسلی دی فکر نہ کرو تیری بھرجائی تیرے لیے حلال گوشت پکاتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں باغ مسیح کو بڑی دعائیں دیتا۔ دو ہفتے گزر گئے تو بڑے ڈاکٹر سے پوچھا ''ڈاکٹر صاحب میرے زخم تو بھرتے جا رہے ہیں، چھٹی کب ملے گی؟'''' جمال میاں پوری طرح اطمینان کر کے پھر آپ کو گھر بھیجیں گے۔'' اسے ہسپتال کی دنیا سے کچھ لگاؤ سا ہونے لگا۔ ساتھ والے مریض کو گنے کے رس کی طرح میٹھی میٹھی باتیں سناتا۔ جب بھی سسٹر جی اس کا بخار اور بلڈ پریشر دیکھ کر لوہے کے بستر پر ٹانگوں کی طرف اٹکے ہوئے چٹکی گتے پر اندراج کرتی تو بڑی محبت سے اسے دیکھتا رہتا اور اس کے گھر کے حالات پوچھتا جو وہ ہمیشہ اپنی ساس کی شکایتیں کر کے اپنا دل ہلکا کر لیتی، یعنی رات کو اس کے کمرے میں سب سسٹر آن ڈیوٹی، صفائی کرنے والا، ڈاکٹری کالج کے طالب علم جو رات کو کام سیکھنے کے لیے آتے اس کے کمرے میں محفل جما لیتے۔ کسی رات میں سب مصروف ہوتے تو صفائی کرنے والے جمعدار کے ساتھ وارڈ کے باہر والے پارک کے کونے میں بیٹھا جمعدار کے عشق کے قصے سنتا جو ہمیشہ چرس کے سوٹے کے بعد جمعدار کے رونے پر ختم ہوتا، یعنی ہر ایک کو یہ یقین دلاتا کہ اس کی میری کہانی اُن سے بہت ملتی ہے۔ سسٹر جی کو اپنی جھوٹ موٹ کی ساس کے طعنے اور قصے سناتا۔ جمعدار کو اپنی تخیلاتی محبوبہ کے من گھڑت قصے سناتا۔ ڈاکٹر صاحبان چوں کہ پڑھے تھے لکھے تو ان سے گپ شپ نہ لگاتا کہ یہ میرا جھوٹ پکڑ لیں گے۔ مہینے کے بعد بڑے ڈاکٹر نے جمال کو بتایا کہ مکمل طور پر علاج کے کے لیے تمھیں کیموتھراپی دینی پڑے

گی۔ جمال نے پھر دل کو تسلی دی جڑوں والا پھوڑا ہے، اس کو جڑوں سے اکھاڑنا آسان تھوڑا ہے لیکن یہ سن کر افسردہ ہو گیا کہ اس علاج سے سر کے بال جھڑ جائیں گے تو موضع باغ کا کھودا مستری یاد آ گیا جس کے جسم پر کوئی بال نہیں تھے بلکہ آنکھوں کی بھنویں بھی نہیں تھیں۔ اس کی کھال بالکل عورتوں کی مانند ملائم تھی۔ سسٹر جی سے پوچھا تو اس نے تسلی دی نہیں صرف سر کے بال گریں گے۔ یہ سوچ کر تسلی دے لی کہ اس عمر میں کوئی لڑکی تو ہاتھ تھامے گی نہیں۔ سب گنجے لوگوں کو یاد کرنے لگا تو حساب کتاب میں سب سے مشہور، علم والے اور امیر گنجے ہی تھے۔ چلو کچھ چیزیں تو مشترک ہیں بڑے لوگوں کے ساتھ۔ کیموتھراپی کے ٹیکوں کی جب قیمت سنی، باپ رے باپ اتنا مہنگا علاج تو صرف امیر لوگ ہی برداشت کر سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو یقین دلانے لگا تم واقعی امیر ہو۔ بھلا ہو باغ مسیح کا ڈاکٹر کے پاس جو یہ ٹیکے نمونے کے لیے آتے تھے، وہ انہوں نے جمال کے استعمال کیلئے وقف کر دیئے۔ ٹیکوں کے اثرات بہت تکلیف دہ تھے، یعنی ٹیکوں کا کورس شروع ہوا تو جمال کا وزن کم ہونے لگا۔ اجابت کے لیے بار بار غسل خانے جانا پڑتا۔ گالیں اندر کو پچک گئیں۔ سر کے بال ایک دم غائب ہو گئے۔ ایک دن بڑے ڈاکٹر نے اور ڈرا دیا کہ تمھیں ریڈیو تھراپی بھی دی جائے گی تو سسٹر جی نے سمجھایا کہ پھوڑے والے مقام پر بجلی لگائی جائے گی۔ جمال اور بھی ڈر گیا۔ اسے یاد تھا جب موضع باغ میں سرکاری ٹیوب ویل چلانے کے لیے بجلی کے کھمبے لگے تو ہر روز تاروں پر بیٹھے دس بارہ کوے مر جاتے اور رشید بھی بجلی کی تار کو چھونے والی شرط میں اپنی جان ہار بیٹھا تھا۔ لیکن جب سسٹر جی نے تسلی دی کہ بجلی کی شعاعیں پھوڑوں کے اندر نقصان پہنچانے والی جگہوں پر ہی صرف حملہ آور ہوں گی، تمھیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ یہ تو بس ہنسنے کھیلنے کی چیز ہے تو وہ بڑا خوش ہوا۔ جب ریڈیو تھراپی سے پہلے کمپوڈر بابو نے اس کے پیٹ پر سیاہی سے کچھ لکیریں کھینچیں تو یوں لگا کہ وہ جیسے بجلی سے اپنے جسم پر بارہ گوٹی کھیلے گا۔ پھر تمنا کی کہ اگر یہ بجلی کوئی لڑکی ہوتی تو اس کو کہتا میرے جسم پر شٹاپو کھیل لو۔

کیموتھراپی، ریڈیوتھراپی اور نہ جانے کون کون سی تھراپیوں نے جمال کو کمزور سے کمزور تر بنانا شروع کر دیا اور سوچنے لگا کہ خواب میں آنے والا کھر جنجال واقعی اس کی زندگی کے پیچھے لگا ہے۔ چھ مہینے زندگی کی جنگ جیتنے میں لگ گئے لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ کمزوری اور لاغری جسم اور چہرے پر ہلدی کے رنگ میں ظاہر ہونے لگی لیکن باغ مسیح کی دوستی کے رنگ نے محبت کی سرخی کو پھیکا نہ پڑنے دیا۔

ایک دن بڑے ڈاکٹر صاحب نے جمال کے مضبوط ارادوں میں دراڑ ڈال دی۔ انہوں نے خبر سنائی کہ کینسر واپس آ کے پورے پھیپھڑوں میں پھیل گیا ہے۔ ایک پھیپھڑا تو بالکل ناکارہ ہو گیا ہے۔ جمال نے بھی محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اسے سانس لینے میں دشواری بھی ہوتی ہے اور یہ کہ سانس نہ کھلنے کی تکلیف بڑھنی شروع ہو گئی ہے۔ اسے یوں لگتا کہ سانس بس گلے، ناک اور حلق کے درمیان رک جاتا ہے۔ سانس نکالنے کی پوری کوشش میں جیسے اس کی آنکھیں باہر نکل آتیں۔ یوں لگتا کہ کھر جنجال اس کا گلہ گھونٹ رہا ہے۔ سانس نہ نکلنے کے دورے وہ کبھی کبھی تو جان لیوا ہو جاتا۔ اسے تکلیف ہوتی کہ وہ واقعی کھر جنجال کی منتیں کرتا، مجھے مار دو، میں ہار چکا ہوں، میری جان نکال لے اور وہ سوچنے لگا موت کتنی مشکل سے آتی ہے۔ ساتھ والے بستر پر لیٹا مریض اس کی تکلیف کو برداشت نہ کر سکتا۔ اسے تسلی دیتا اور دل میں اس کے مر جانے کی دعا مانگتا۔ اس کی تکلیف کی چیخیں سارا وارڈ سن کر اس کے لیے دعا مانگتا۔ ہسپتال میں مریضوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی اور جمال کی زندگی کی ناامیدی نے ہسپتال کے سٹاف کو پریشانی میں ڈال دیا۔ بچنے کی اب کوئی امید نہیں تھی۔ ایک شام جمال کو تکلیف اور سانس بند ہونے کا شدید دورہ پڑا اور بڑے ڈاکٹر کو ایمرجنسی کے لیے بلانا پڑا۔ جمال کی حالت دیکھ کر اس نے فیصلہ سٹاف کو سنایا۔ جمال آج کی رات نہ نکال سکے گا۔ بڑی سسٹر نے ہسپتال سے خارج ہونے کے کاغذات مکمل کر لیے اور موت کے سرٹیفکیٹ کا فارم نکال کے مکمل کرنے کے لیے تمام انفارمیشن بھر دی۔ کچھ

سوالات رہ گئے تو فائل جمال کے بستر کے ساتھ والی چھوٹی میز پر رکھ کر جمال کو بیہوش دیکھ کر چلی گئی۔ جمال سے تکلیف برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی جان لینے کا فیصلہ کرلیا۔ غنودگی میں عالم تکلیف کے ساتھ ہڑ بڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اس کا ساتھی مریض اسے دیکھ رہا تھا۔ جمال نے اٹھ کے کراہتے ہوئے ساتھی مریض کو بتایا میں نے دیوتا کو سانپ کے روپ میں دیکھا ہے۔ ناگ دیوتا کے ہزار سر تھے اور وہ سمندروں، میدانوں اور دنیا کے تمام خزانوں کا مالک میرے گلے میں لپٹا ہے۔ میں اس سے موت کی بھیک مانگ رہا ہوں کہ مجھے اس زندگی کی تکلیف سے نجات دلا۔ پھر اس نے اپنے ایک بڑے سر کے منہ سے اپنے تمام بچوں کو نگل لیا، جیسے اس نے اپنے تمام بچوں کو کھالیا ہو۔ جب وہ میرے جسم سے جانے لگا تو میں نے اس سے پوچھا تم نے اپنے سارے بچوں کو تو کھالیا ہے، مجھے بھی کھالے۔ اس نے اپنے سارے بچے منہ سے اگل دیے، وہ یہ کہہ کر چلا گیا" میں اپنے بچوں کو کھاتا نہیں ہوں، میں نے ان کی حفاظت کی تھی"۔ جمال نے میز پر رکھی ہوئی فائل کو دیکھا تو اس نے اس میں سے اپنی موت کا سرٹیفکیٹ اٹھا کے تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور لڑکھڑاتا ہوا پیشاب کے بہانے کمرے سے نکل کر ہسپتال سے باہر نکل آیا اور طے کرلیا کہ درد کے دورے کی تکلیف برداشت نہیں ہوگی۔ دورے سے پہلے اپنی جان سامنے والے ٹرک کے سامنے کھڑا ہو کر دے دوں۔ سڑک کے درمیان بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال کے کھڑا ہوا تو ٹرک ڈرائیور نے بڑی زور سے بریک لگا کر ٹرک روک لیا اور لگا برا بھلا کہنے، جمال نے اسے اپنی بپتا بتائی۔ ٹرک ڈرائیور کو بہت رحم آیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے التجا کی کہ اگر میں کوئی مدد کرسکوں۔ اس نے کہا مجھے کسی طرح کسی سپیرے کے پاس پہنچا دو۔ ٹرک ڈرائیور کو سپیروں کی بستی کا پتا تھا۔ اس نے جمال کو سپیروں کی بستی میں چھوڑ کر اسے زندگی کی دعائیں دیتا چلا گیا۔ جمال گرتا پڑتا ایک سپیرے کی جھگی میں جا پہنچا۔ اس سے التجا کی مجھے درد کے دورے سے پہلے کسی زہریلے سانپ سے ڈسوا کے مار دو۔ سپیرا ڈر گیا اور اس نے ایک چھوٹی

سی ڈبی میں سے مالٹے رنگ کے سفوف میں ڈھکی بالوں والی ایک چیز دی کہ لے جاؤ۔ یہ گیدڑ سنگھی تمہارے سب ارمان پورے کردے گی۔ تجھے حسین عورت مل جائے گی۔ تجھے دولت مل جائے گی۔ جمال کو سپیرے کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے سوچا کہ سپیرا گیدڑ سنگھی سے خود امیر اور خوبصورت عورت کیوں نہیں حاصل کر لیتا۔ جمال نے ہاتھ جوڑ کے التجا کی کہ مجھے موت کی بھیک دے دے۔ زندگی میری برداشت سے باہر ہے۔ سپیرا پھر بہانہ بنانے لگا کہ ہم سپیرے سانپ کے کاٹے کا علاج کرتے ہیں، میرے پاس شیش ناگ کا منکا ہے جو زہر چوس لیتا ہے۔ اسی اثناء میں جمال کو پھر دورہ پڑنے لگا تو اس کی حالت دیکھ کر اسے جمال کی باتوں پر یقین آنے لگا۔ پھر سپیرے نے کہا کہ تکلیف کی برداشت میرے بس سے باہر ہے، جلدی کرو۔ سپیرے نے اپنی سانپ والی پٹاری اٹھائی، سانپ کی بیضوی آنکھیں پلک نہیں جھپکتی تھیں۔ اس کی کھال پر بنا ہوا ڈیزائن بڑے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں لگے ہوئے پردے میں بنے ہوئے ایک ڈیزائن کی متواتر چھاپ تھی۔ سانپ کی زبان سپیرے کے ناک جتنی لمبی تھی جو کھانے والے کانٹے کی طرح دو حصوں میں تقسیم تھی جسے وہ بار بار باہر نکال کر اپنے گردونواح کو دیکھ رہا تھا۔ منہ کے دونوں کونوں میں دو لمبے نوکیلے دانت تھے جو موت کا امرت زندگی کے جام میں پیش کرنے کیلئے بے قرار تھے۔ سپیرے نے پٹاری کا ڈھکنا آدھا کھول کر جمال سے کہا اس میں اپنا ہاتھ ڈال دو۔ جمال نے اپنا ہاتھ پٹاری میں ڈال دیا۔ سانپ نے اپنے جسم کو دائرہ در دائرہ بناتے ہوئے پورے زور سے اپنے زہریلے دانت جمال کے ہاتھ میں پیوست کر دیے اور پورا زہر دانتوں کے ذریعے جمال کے جسم میں زہر کے انجکشن کی طرح منتقل کر دیا۔ جمال کو ہلکی سی تکلیف ہوئی لیکن دورے کی تکلیف سے بہت کم تھی۔ جمال نے سپیرے سے پوچھا کتنی دیر میں زہر اپنا اثر دکھائے گا؟ اس نے بتایا پانچ گھنٹے تو لگ جائیں گے۔ اس نے سپیرے کو گلے لگایا اور شکریہ ادا کرتا ہوا موضع باغ کی طرف اپنے گھر کو روانہ ہو گیا۔ سپیرے نے اسے مرنے کی دعا دی۔

وہ بڑی مشکل سے گھر پہنچا اور اپنی ڈھیلی ڈھالی چارپائی پر لیٹ گیا جس سے اس کا جسم ڈھلک کر زمین کو چھونے لگا۔ سانپ کے زہر نے راستے میں ہی کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ جمال کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا، گلے میں سانس ایسے اٹکنے لگی جیسے سانپ نے گلے میں پھندا ڈال دیا ہو۔ اس کی سانس دورے پڑنے کی طرح رکنے لگی۔ جمال سمجھ گیا اب وقت آ گیا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی تصویریں ذہن کے پردے پر ابھارنے لگا تو کچھ بن نہ پایا کیونکہ اس نے ماں باپ کو دیکھا تک نہ تھا۔ اپنی خیالی محبوبہ جو بالکل موت کی شکل میں اس کے سر کو اپنی گود میں لیے ہوئے تھی، اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش موت تھی جس کو وہ گلے لگانے کا خواہشمند تھا۔ وہ غنودگی کی حالت میں سو گیا۔ دو دن سوتا رہا۔ دو دن کے بعد اٹھا تو بھوک سے تڑپ رہا تھا۔ حیران ہوا کہ مرنے کے بعد بھی بھوک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ جمال سمجھ رہا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔ اٹھ کر کارنس پر داڑھی بنانے والی سیفٹی کے پاس پڑے ہوئے گول شیشے میں دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس کے سر کے بال تھوڑے تھوڑے اگ آئے تھے۔ جلدی سے بھاگ کر ہوٹل سے جی بھر کے کھانا کھایا۔ پھر سانپ کے ڈسے ہوئے ہاتھ پر دو دانتوں کے نشان دیکھے اور اپنی چھنگلی انگلی کو دانتوں سے زور سے کاٹا تو یقین کر لیا کہ وہ زندہ ہے لیکن ابھی لاغری اور کمزوری کی وجہ سے جسم میں چستی نہیں تھی اس لیے اپنے آپ کو تھوڑا سا صحت مند محسوس کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کی رگوں میں سانسوں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اسے ہر چیز آسمان، درخت، زمین، لوگ، ہر چیز خوبصورت لگنے لگی۔ بھاگ کر بستی کی ندی کے کنارے جا پہنچا۔ اس میں کنکریاں پھینک کر پانی میں کنڈلیاں مارتے ہوئے سانپ بنانے لگا۔ گردن نیچے کر کے دیکھا تو جیب میں موت کا سرٹیفکیٹ تہہ کیا ہوا پڑا تھا۔ اسے نکال کر اس کو کاغذ کی ناؤ بنا کر ندی میں بہا کے جانے لگا تو اس کو ایسے لگا کہ اس نے پانی میں کسی کو دیکھا ہے۔ مڑ کے واپس آیا، غور سے پانی میں جھانکا تو اس کا اپنا عکس پانی میں جھوم رہا تھا۔ اس جھومتے ہوئے چہرے پر لگا کہ سکتے ہونٹ اسے یہ کہہ رہے ہوں۔

"اگر تم سمجھو کہ دنیا نے تم سے منہ موڑ لیا ہے، ایک دفعہ اور دنیا کو ضرور غور سے دیکھ لو"

☆☆☆

جگل بندی

''دھادھن تا''۔۔۔کیا حال ہے ''تا دھن تا'' آپ کا۔ طبلے نے پوز مار کے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے بڑی نشیلی آنکھوں میں سے ایک کو دباتے ہوئے سارنگی کو کہا۔ سارنگی کو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ ''گاماپا'' کیا کہا آپ نے ''تا کڑ دھن نہ دھن دھن دھنا'' مجھ سے کچھ فرمایا۔ ''میں نے تو کچھ نہیں کہا۔'' طبلے خاں کچھ گھبرا گئے۔

سارنگی نے ساز چی کے پلو کو ٹھیک کیا بایاں کندھا اوپر مار کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

طبلے نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ کر گنگنایا ''باغوں میں بہار ہے۔'' اور منہ دوسری سمت پھیر لیا۔

سارنگی پھر رک گئی۔ اب تم کہو گے ''مجھے تم سے پیار ہے۔''

''اس میں برا بھی کیا ہے۔'' طبلے نے کہا۔ ''ہمارا خاندان تو ایک ہی ہے۔ اکٹھے اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے کی ہستی کا سامان۔ تو سے تم اور پھر تو کا عنوان ہونے میں برائی کیا ہے۔'' ''اپنی شکل دیکھی ہے گنجے۔ رات کو باہر مت نکلنا چاندنی کی روشنی میں لوگوں کو شرمندگی ہو گی۔ وہ قمقمے کا بٹن ڈھونڈتے ڈھونڈتے ناکام لوٹیں گے۔ یا تنی

گاگ کارا بائی مقدمہ کر دے گا کہ تم نے ان کا یاما کا (چھوٹی ٹوپی) چرا لیا ہے۔ یہ تو اللہ بھلا کرے ہمارے دیس کا کھانا ہو نہ ہو برتنوں کی کمی نہیں ورنہ چمڑے کے ڈھکن کو ہٹا کر ہانڈی کے طور پر استعمال کر لیتے۔"

"بس بس بی سارنگی زیادہ مت بڑھو۔ اپنے بے سرے تاروں کو لگام دو۔ یہ تو ہم ہی ہیں جو تجھے تال میں رکھتے ہیں اور تمہیں اس قابل بناتے ہیں کہ تمہیں لوگ سن سکیں۔ ورنہ کیا ہو تم۔ فقیر کی کتیا کی طرح چوں چوں اور روں روں کرتی رہتی ہو۔" "لو سن لو۔ یہ آ گئے ہیں گدھے صاحب گلقند کا بھاؤ لگانے۔ اے نابلد میں وہ ہوں جو انسانوں کے گلے کے قریب تر ہوں۔ میں سب وہ آوازیں میں نکال سکتی ہوں جو ایک انسان اپنے گلے سے نکالتا ہے۔"

"ہوں۔۔۔ اتنی ہمت ہے تو توڑ کے دکھاؤ اس شیشے کے گلاس کو۔ جو مہدی حسن نے اپنے گلے سے نکالتے ہوئے سر سے توڑے تھے۔ آگ لگا اس تالاب میں جو مہاراج بجوا لگاتے تھے۔ برکھا برسا جو میاں تان سین بن موسم برسات لے آتے تھے۔"

غصے میں سارنگی نے اپنی بھنوں کو اوپر کیا۔ اور ماتھے پر ابھرتی ہوئی شکنوں سے موسیقی کی علامتیں بنائیں۔ پھر ہلکا سا مسکرا کر کہا۔" مجھے سن کر بڑے بڑے شہنشاہ اور ولی سر دھنتے ہیں۔ میں مجمع باز نہیں ہوں جو منہ سے آگ نکالوں یا دانتوں سے سریا ٹیڑھا کر دوں۔

اوے تیسری دنیا کے فقیر کے کٹورے تیرا منہ بند نہ ہوتا تو بے سرا ہو کے بھیک ہی مانگتا۔ مجھے دیکھ میری بہن وائلن کا رنگی ہال اور البرٹ وکٹر کے تھیٹروں میں اپنا جادو جگاتی ہے۔ میرا چچازاد بھائی شیلو (chalo)۔۔۔"

طبلے نے جھٹ سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔۔۔

"اسی کو تو سن کے تھوڑن بہرا ہوا تھا۔"

سارنگی نے سر موڑ کر طبلے کو حقارت سے اوپر سے نیچے دیکھ کر کہا۔" اپنے آپ کو

دیکھ جیسے اٹھارہویں صدی کا سٹیم انجن کھانس رہا ہو۔ اور شرم سے ڈوب مر۔ اپنی ماں پکھاوج کے پیٹ کے آپریشن سے تو پیدا ہوا تھا۔ امیر خسرو کو دعا دے جو تجھے اس دنیا میں لایا۔ فطری طریقے سے تو اس دنیا میں آیا نہیں۔"

طبلے نے غصے سے جواب دیا۔ "اور تو کیا ہے۔ بندر کی سوکھی کھال پر جب حکیم صاحب نے گھوڑے کی پونچھ کے بالوں کو رگڑا تو تجھے وجود ملا۔

بھلا ہو۔ پنجاب اور راجستھان کے دیہات کے علاوہ کوئی پہچانتا ہے تجھے؟؟ ہاں یاد آیا۔ کوٹھوں پر بجتی ہے تو۔ لوگ پیسہ پھینکتے ہیں تو تیری کمر ہلتی ہے۔ ارے بازارو ہے بازارو تو۔

اور دیکھ مجھے جب بھی لوگ خوش ہوتے ہیں مجھے یاد کرتے ہیں۔

"دھاک دھنک دھن تھاک" کی جب تھاپ پڑتی ہے تو جسم لرز اٹھتے ہیں۔ جسموں میں خون گردش کرنے لگتا ہے اور کیا بات ہے چچا ڈھول کی جب بجتا ہے تو کوئی بیٹھ نہیں سکتا۔ ہاتھ آسمان پر اٹھ جاتے ہیں بھنگڑا، لڈی، دھریس فصل کے کٹنے کی خبریں، کڑماتی کا سندیسہ، ہاتھوں پے بنے پھول کے ڈیزائنوں کی مہندی، دولہا کے سر پر پڑا سہرا، اور دلہن کا لمبا گھونگھٹ میری ہی تانوں سے اٹھتا ہے۔"

"اللہ پے جاؤ اپنی تعریفوں کے راگ۔"

سارنگی نے اپنے بائیں ہاتھ سے کان کی بالی کو درست کیا اور چھوٹا سا گول آئینہ نکال کر اپنی ہونٹوں کی پھیلی ہوئی لپ سٹک کی حدوں کو سرخ پنسل سے ترتیب دیا۔

"ایسے بھی گدھے ہیں دنیا میں جو اپنے پٹنے پر خوشیاں مناتے ہیں۔ استاد صاحبان تیری پیٹھ کو کوٹ کوٹ کر ایسی درگت بناتے ہیں اور جب تیری شلوار کا ازار بند ڈھیلا ہو جائے تو تیرے ٹخنوں اور کمر کی ایسی پٹائی لکڑی کے ہتھوڑے سے کرتے ہیں کہ دوبارہ شلوار

ڈھیلی کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔۔۔ پر تو ٹھہرا گدھا کا گدھا۔ پھر شلوار ڈھیلی، شادیوں پر اتنی بے شرمی کا شور عبداللہ کی طرح مچا رہے ہو۔ جو بیگانی شادی میں دیوانوں کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ طبل مہاراج کو تو ڈھیٹ ہونا چاہیے۔ عزت تو آنی جانی چیز ہے۔"

"تم کیا ہو۔" طبلے کو غصہ آ گیا۔ "ہمیشہ روتی رہتی ہو۔ اوں اوں اوں۔۔۔ جیسے تیلی تیل کے کولہو کو آہستہ آہستہ گھما رہا ہو۔ یا چینی گلوکارہ کے گلے میں (chopstic) چاپ سٹک پھنس گئی ہو۔ تبھی استاد ہمیشہ تیرے کان مروڑتے رہتے ہیں۔" سارنگی نے خونخوار آنکھوں سے طبلے کی طرف دیکھا۔

"اے ان پڑھ سورنگی ہوں میں سورنگی۔ سورنگوں کے ملاپ سے ان گنت رنگ بنتے ہیں۔ دنیا کا کوئی ایسا رنگ نہیں ہے جو میرے گلے سے نہ نکل سکے۔"

"تا کڑ دھن تھا" نکال کے دکھا اس آواز کو طبلے سے جھوم کر کہا۔

"اوں اوں ایں آں" سارنگی نے آواز نکالی۔ "بی سارنگی جاؤ حکیم نیر واسطی سے تان سین گولیوں کی ڈبیہ لے آؤ۔ شاید کچھ کام آ جائے۔ بی سارنگی میرے خاندانوں کا نام سنو گی تو جھٹکا کھا جاؤ گی۔ چھ گھرانوں نے میری پرورش کی ہے۔" "دیکھیں تو سہی کس کس گھرانے نے اس لعل کے پیدا ہونے پر کوئلے بانٹے تھے۔" سارنگی نے ناک چڑھا کر پوچھا۔

"لکھنو کے نوابوں میں ہمارا بچپن بڑا ہوا ہے۔" طبلے نے ذرا جھک کے آداب کیا۔ "زندگی گزارنے کا سلیقہ اور آداب ہمیں لکھنو سے ملا ہے۔"

"تبھی تو۔۔۔" سارنگی نے اپنے ہاتھ سے سر سے پاؤں کا اشارہ کیا۔

"پہلے آپ، پہلے آپ کے چکر میں آج تک ترقی کی گاڑی پر سوار نہیں ہو سکے۔ کچھ بھی ہو گاڑی پکڑو نہ پکڑو اخلاق کو نہیں چھوڑا آپ نے۔"

"آگے بڑھیے۔" سارنگی نے نوابوں کی طرح جھک کر ہاتھ کے اشارے سے کہا

''نواب چھنن کے اگال دان صاحب۔''

طبلے نے انار کے پھول کو سونگھا۔''ہوں۔۔۔دلی گھرانے سے ہیں ہم۔ شاہی قلعہ، مغلیہ سلطنت دلی کی پارلیمنٹ میرے محافظ ہیں۔'' طبلے نے اکڑ کر فوجی انداز میں سلیوٹ مارا سارنگی نے پیر کو جھٹکا۔''زیادہ بڑھ بڑھ کے مت بول۔ دلی میں ہلدی رام کی دکان کے سامنے ایسے پٹو گے کہ زخموں پر لگانے کے لیے ہلدی چونا نصیب نہیں ہوگا۔''

طبلے نے اونچی آواز میں بڑھک لگائی۔'' پنجاب کے گھرانے نے لسی اور مکھن سے میری پرورش کی ہے۔ میرا قد کاٹھ اور میری وجاہت پنجاب کی کھلی آب وہوا میں پروان چڑھی ہے۔''

''ہوں''۔۔۔سارنگی نے تمسخرانہ انداز میں گردن کو دائیں طرف موڑا۔'' پنجاب والوں پے اتنا نہ اکڑ۔ ترے گنجے سر کو بنجر زمین سمجھ کر اس پر کھیتی باڑی شروع کر دیں گے۔ گندم اگا دیں گے تیرے چٹیل میدان پر اور جو تم بڑے کلچر کلچر کا شور مچاتے ہو۔ اسے ایگریکلچر بنا دیں گے۔''

طبلے نے گھنٹی کی آواز نکالی۔ جیسے کسی نے مندر میں گھسنے سے پہلے پرنام کیا ہو۔ ''بنارس کے مندر میری آتما کی رکشا کرتے ہیں۔ میری روح میں سکون بنارس کے گھرانے نے بھرا ہے۔''

سارنگی کو کچھ یاد آیا۔ اور جھٹ سے ایک چھوٹی سی ڈبیہ سے ایک پان نکال کر اس سے چھالیہ درست کیا اور پان کو لپیٹ کر منہ میں ڈالا۔

''ابے بنارس والے پان کی گلوری تو میرے منہ میں ڈالتے ہیں اور میرے سر کو بھی بنارسی ساڑھی سے ہی ڈھانپتے ہیں۔ تو نے اگر بڑھ بڑھ کے بنارس کے بارے میں باتیں کی تو تیری چتا کی راکھ گنگا کی موجوں میں ملہار گا رہی ہوگی۔

بس بس مجھ پر اور گھرانوں کا رعب نہ ڈال۔''

ابھی طبلہ اور سارنگی اپنی بحث میں مبتلا تھے کہ اس خوشخبری نے دونوں کے سب گلے شکوے دور کر دیے۔ یوں لگا کہ آسمان آتش بازی کے رنگ برنگے جگنوؤں کی روشنی سے جگمگا اٹھا ہو۔ جیسے کسی نے سارنگی کی تار کی بنی اور طبلے کی چمڑے کی پٹی بنی رگوں میں زندگی کی روح پھونک دی ہو۔ آنکھیں خوشی سے جگمگا اٹھی ہوں۔ زندگی کی اہم خوشخبری جس کا انہیں عمر بھر انتظار تھا ان کی امنگیں تا حیات بھیک مانگتی رہی تھیں۔ اور وہ وقت آ گیا۔

سارنگی کا محبوب اس کی حسرتوں کو تسکین دینے والا استاد سلطان خان صاحب اس کا اور طبلے کا ملاپ خان ذاکر علی خان کے ساتھ نیویارک کے کارنگی ہال میں ہوگا۔ یہ خبر دونوں کے لیے ایسی تھی جیسے ان کی زندگی کی تلاش اپنی منزلوں کو طے کرنے والی ہے۔ ان کی حسرتوں کی ہیر کو قرار دینے والے رانجھے ان کی من کی بنسری کو منہ سے چھوئیں گے۔

دونوں نے لمحے گننے شروع کر دیے۔ ایک ایک لمحہ جیسے صدیوں کو ماپ رہا ہو۔ ان کے خیالوں کے شہزادے ان کے خوابوں کو حقیقت میں بدل دیں گے۔ بس یوں تھا جیسے ان کی شادی اس سے ہو رہی ہے جس سے انہیں عشق تھا۔

دونوں نے اپنے دولہا کی تعریفوں کے تانتے باندھ دیے۔ بس واری واری جا رہے تھے۔ طبلے میاں تو بس تعریفوں کے پل باندھے جا رہے تھے۔

ہائے کیا میرے محبوب کا خاندان ذاکر کے ابا اللہ رکھا خاں صاحب کے پاؤں تو شہنشاہ چھوتے تھے۔ جب میرا شہزادہ ذاکر چلتا ہے تو بلبلیں ذکر چھوڑ دیتی ہیں۔ ساری ہوائیں، ساری فضائیں، ساری کی ساری کائنات ذکر الٰہی بھول کے ذاکر کا ذکر کرتی ہیں۔ ذاکر کا ذکر ہی تو مجھے الٰہی کے ذکر کی سرنگ سے الٰہی سے ملاتا ہے۔

سارنگی کے سلطان کی انگلیوں میں شرارے بھرے ہیں جادو سے بھری انگلی کے ایک اشارے سے ساری کائنات جھومنے لگتی ہے۔ آسمان کے لب مسکرا کے ستارے چھوڑنے لگتا ہے۔ ندیاں، جھرنے، آبشار گنگنانے لگتے ہیں۔ برفیں پگھل کر دھرتی کے جسم

کو گیلا کرنے لگتی ہیں۔ ساگر خاموشی سے اپنی جسم سے دریاؤں کو پھوٹنے کی اجازت دیتا ہے۔ ایک ہلچل اور تلاطم برپا ہوتا ہے۔ بس ایسا ہے کہ یہ کائنات اس انتظار میں رہتی ہے کہ خوشیوں کا سلطان بس لذتوں کی گٹھڑی کھول دے۔

اور پھر وہ وقت آن پہنچا۔ جب سلطان خاں صاحب اور ذاکر دولہا بنے۔ کارنگی ہال میں شان بے نیازی سے داخل ہوئے۔ یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا سے آئے ہوئے باراتی فخر سے پھولے نہ سمارہے ہوں۔ کہ وہ دنیائے موسیقی کے بادشاہوں کی دعوت میں شمولیت کے لیے کچھ بھی نذرانہ پیش کر سکتے ہیں۔ ہر نسل ہر رنگ کے لوگ اپنی اپنی شخصیت کو بھول کر اتنی بڑی ہستیوں کا خیر مقدم کرنے آئے ہوئے تھے۔

طبلہ اور سارنگی غلاف میں لپیٹے ایسے بیٹھے تھے جیسے دلہنیں سولہ سنگھار کر کے اپنے دولہا کا انتظار گھونگھٹ میں شرماتے ہوئے کر رہی ہوں۔

دونوں نے جب اپنی دولہنوں کو پیار سے دیکھا تو ان کی آنکھیں شرم و حیا سے سٹیج کے فرش میں دھنس گئیں۔ دونوں کے جسم تڑپ رہے تھے اپنے محبوب کی بانہوں میں سمٹ جانے کے لیے۔

دونوں نے غلاف کو ایسے اتارا۔ جیسے دلہن کا گھونگھٹ اس کے مجازی خدا نے اٹھایا ہو۔ جسم اپنے محبوب سے لپٹ جانے کے لیے بے تاب تھے۔ جب دولہا کی انگلیوں نے دلہن کے جسم کے ان نقطوں کو چھوا تو ان کے جسم کا ایک ایک مسام جاگ اٹھا اور جب سلطان خاں صاحب نے سارنگی کو اپنی گود میں بٹھا کر اپنے سینے سے لگایا تو سارنگی موم کی طرح پگھل کر خاں صاحب کے جسم لپٹ گئی۔

اور جیسے ہی طبلے کے رخساروں پر ذاکر خاں صاحب کا ہاتھ لگا تو جیسے وہ سرخی

پاؤڈر سے اپنے محبوب کا سنگھار کر رہے ہوں۔

آہستہ آہستہ دونوں نے اپنی محبت کے اظہار کا آغاز کیا۔ دونوں کے جسموں پر ہاتھوں کا لگنا تھا کہ دونوں دلہنوں کی آنکھیں مستی سے بند ہونے لگیں۔ محبت کی کاریگری کا استعمال بڑھنے لگا۔ طبلے اور سارنگی کے جسم مستی میں لرزنے لگے سانسیں تیز ہونے لگیں تو ہال میں سے آواز آئی کہ ابھی جوڑے الاپ میں ہیں اور خراماں خراماں جوڑوں میں تیزی آنی شروع ہوئی۔ تیزی اور تیزی، سانسیں پھولنے لگیں۔۔۔ اور تیزی۔ جوڑوں کے جسم ان کے قابو سے باہر نکل گئے۔ جسموں میں ارتعاش پیدا ہوا بس پھر کیا تھا ایک سفید نور کی روشنی ایک دم جگمگا اٹھی۔ جیسے سب کے جسموں میں پھلجھڑیاں پھوٹ پڑی ہوں۔ ایک دم سب بے حس ہو کے بے دم ہو گئے۔ یوں محسوس ہوا جیسے سفید روشنی میں انہوں نے خدا کو دیکھ لیا ہو۔

ایک نور تھا جو سب کے جسموں سے پھوٹ رہا تھا۔

کارنگی ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ سب عزت و احترام سے کھڑے ہو گئے۔

تیسری لائن میں بیٹھے ہوئے استادوں نے یک زباں ہو کے کہا۔۔۔

واہ کیا سم تھا۔۔۔

☆☆☆

چاند پستان یا دودھ کا پیالہ

''تھینک یو، مام۔'' یاسر نے الفارومیو کی چابی کو انگلی میں گھماتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری سالگرہ کا سب سے اچھا تحفہ ہے۔ ہمارے وقت میں بہت کم لوگوں کو ایسا تحفہ ملا ہوگا۔''

''سپیشلز کے لیے تحفہ بھی تو سپیشل ہونا چاہیے۔'' ''اوتھینک یو...... لیکن مام اتنی تیار ہو کر کہاں جا رہی ہیں۔ آپ تو اتنی خوبصورت ہیں اور میک اپ میں بالکل جوان لگتی ہیں۔'' ''تھینک یو، مائی سن!

میں ذرا سیٹھ جمشید کے ساتھ ڈنر پہ جا رہی ہوں۔ ڈیڈ کو مت بتانا۔ بس کہہ دینا این جی او کی میٹنگ ہے۔''

''مام آج میری سالگرہ کے موقع پہ ایک چیز کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو رشتوں سے نہیں پکاریں گے۔ ایک ہی ڈائمنشن میں منجمد ہو جاتے ہیں۔''

''اگر تمھیں یہ سب پسند ہے تو ٹھیک ہے۔ تم مام کی بجائے ریٹا اور میں یاسر۔''

یاسر نے چھوٹے کاغذ پہ ڈیڈ کے لیے پیغام لکھا۔ ''ریٹا ڈنر باہر کریں گی۔'' اور الفارومیو کی چابی کو اٹھاتے ہوئے کہا ''آج سے تمہارا نام بھی انجلینا جولی ہے۔ چلو میری انجلینا آپ کی

آغوش میں سما جائیں۔" یاسر دروازہ کھولے بغیر کنورٹ ایبل میں چھلانگ لگا کر الفا رومیو نہیں بلکہ انجلینا جولی کی گود میں دھنس گیا۔

یاسر اور ریتا باؤ ارشد سے پہلے ہی پہنچ گئے اور لکھا ہوا پیغام پھاڑ دیا۔

"ڈیڈ آپ لیٹ آئے رات کو"...... "ہاں سینما ایسوسی ایشن کی میٹنگ تھی۔ خوشیا گروپ کے تین سینما ہال میں نے توڑ لیے ہیں۔ اب ہر فلم کی کامیابی کا انحصار باؤ گروپ کے ہاتھ میں۔ جس فلم کو چاہوں گا تھیٹریکل ریلیز دوں گا۔" "پالیٹکس تو کوئی آپ سے سیکھے۔" "بزنس کی پالیٹکس مختلف ہے بیٹے۔"

صبح ناشتے کی میز پہ سب اکٹھے ہوئے۔ یاسر کی بیوی نے ناشتہ لگایا۔ باؤ ارشد نے جلدی سے ناشتہ ختم کیا اور خوشیا گروپ کی خوشیوں کو تہس نہس کرنے کے جوش میں فوراً نکل گئے۔ یاسر کی بیوی کا باڈی ٹریزر سے اپوائنٹمنٹ تھا لہٰذا وہ اپنے جم سوٹ اور جم بیگ کے ساتھ نکل گئی۔

یاسر اور اس کی ماں اکیلے رہ گئے۔ ہاں ریتا کیسا رہا سیٹھ حشمت کے ساتھ کھانا۔ پتہ نہیں یاسر سکسٹی پلس کے بعد چہرے پہ مکڑی کے بنے ہوئے جالے سے وحشت آتی ہے۔ اتنے پیسے نہیں آپ کے پاس یہ گلے پہ پڑے ہوئے بلوں کو ہی نکلوا کیوں نہیں لیتے سوائے اپنی ریئل اسٹیٹ کے اور کوئی بات ہی نہیں کرتے۔ کم سے کم اپنے چہرے کی لینڈ سکیپ کا ہی خیال کر لیں۔ چھوڑو ان باتوں کو بتاؤ۔ دونوں پول ٹیبل پہ گیندوں کو درست کرتے ہوئے مونا سے کیسا چل رہا ہے۔ بس میاں بیوی ہیں۔ بس وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتی ہے جم سے ڈانس ٹریننگ اور پھر تھیٹر۔ بس کچھ ہم میں ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے۔ کیمسٹری نہیں ہے۔ اس طرح کی انڈرسٹینڈنگ تو خوش قسمت لوگوں کو ہی ملتی ہے۔ ایک جیسی سوچیں ہی تو دو مختلف انسانوں کو آپس میں سمو دیتی ہیں۔ کوشش کر رہا ہوں۔ ہاں یاسر اس کی دلچسپیوں کو سمجھنے کی کوشش کر کے دیکھو۔ ریتا نے اپنے بیٹے کو مشورہ دیا۔ کیا ہی اچھا

ہوتا جیسی آپ ہیں انہی خصوصیات کے ساتھ میری انڈرسٹینڈنگ مونا کے ساتھ بھی ہوتی۔ دیکھو یاسر میں نے تم نے زندگی کا لمبا سفر ساتھ گزارا ہے۔ اونچ نیچ میں ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ خیال رکھا ہے ایک دوسرے کا۔ فطری طور پہ بھی ایک دوسرے کو سمجھ لینے میں مشکل نہیں۔

یاسر نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ نہیں ریٹا۔ یہ سفر اور وقت تو تم نے ڈیڈ کے ساتھ بھی گزارا ہے۔ وہ بات نہیں ہے جو میرے اور تمہارے تعلق میں ہے۔

ہاں یہ تو بات تم نے سچ کی کہی۔ میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں۔ جو راز ہم میں مشترک ہیں شاید ڈیڈ سے تم پوشیدہ رکھتی ہو۔ وہ تو ہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ریٹا نے سٹک سے دونوں گیندوں کے زاویے بناتے ہوئے کہا۔ ہر ایک رشتے کا اپنا ایک زاویہ ہوتا ہے۔ گیند کو سٹک سے مارتے ہوئے کہا۔ زندگی کے کھیل کا ہر زاویہ مختلف ہوتا ہے۔ یاسر کی ماں نے ٹیبل پہ پڑی ہوئی ملکہ گیند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مونا کو جیتنا مشکل نہیں ہے۔ بس کامیاب ہونے کے لیے زاویے سیدھے ہونے چاہئیں۔

یاسر ہمیشہ کی طرح الفا رومیو میں چھلانگ لگا کر بغیر دروازہ کھولے سیٹ میں دھنس گیا۔ گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ کیا سکون ملتا ہے تیری آغوش میں انجلینا جولی۔ جم پہنچا تو مونا جم سے نکل رہی تھی۔ آؤ مونا تمہیں میں لے چلوں۔ اپنی گاڑی یہیں چھوڑ دو۔ میں تو ریہرسل کے لئے تھیٹر جا رہی ہوں۔ نہا میں نے لیا ہے۔ ریہرسل کے لیے یہی لباس ٹھیک ہے۔ ریہرسل میں بور تو نہیں ہو گے۔ نہیں مجھے تو تھیٹر بہت پسند ہے۔ یاسر نے گاڑی بھگاتے ہوئے کہا۔ دونوں ہال میں پہنچے۔ سارے فنکار اکٹھے مونا کا انتظار کر رہے تھے۔ مونا کے آتے ہی ریہرسل شروع ہوگئی۔ موزآرٹ کی کمپوزیشن کے ساؤنڈ ٹریک پہ تمام فنکار ریہرسل کرتے رہے۔ دوسرے ایکٹ کے بعد سب نے بریک لی۔

دونوں کینٹین پہ چائے پینے چلے گئے۔ میرج آف فیگرو میرا پسندیدہ کھیل ہے۔ لیکن یورپین آپرا اردو زبان میں کچھ بات بن نہیں رہی۔ کاسٹیوم یورپین ہوں گے۔ میوزک بھی اور ینجل اور زبان اردو۔ ذرا سوچو مونا اگر آغا حشر کو انگریزی زبان میں تبدیل کریں تو آغا صاحب کا حشر برا نہیں ہوگا۔

یاسر یہی تم میں اور مجھ میں فرق ہے۔ چیزوں کو ایک دوسرے میں بدل کے دیکھو۔ تجربے کرو۔ سبجیکٹ کے مختلف پہلوؤں کو جانچنے کی کوشش کرو۔ ہاں مونا تم نے واقعی مجھے نیا راستہ بتایا ہے۔ دونوں بہت خوش تھے اور ایک لمبی ڈرائیو پہ نکل گئے۔ واپسی میں خاصی دیر سے گھر لوٹے۔ دونوں بہت خوش تھے اور تھکے ہوئے بھی تھے۔ فوراً نیند نے انہیں گرم لحاف کی طرح اپنی آغوش میں سمولیا۔

یاسر کی ماں بن سنور کے تیار ہو رہی تھی۔ یاسر سے پوچھا۔ باؤجی حسب معمول اپنے کاروبار میں مشغول ہیں۔ آج گورنر ہاؤس میں بہت بڑی پارٹی ہے۔ غیر ملکی سفیر اور شہر کی بڑی بڑی ہستیاں آ رہی ہیں۔ چلو تم اور میں چلتے ہیں۔ یاسر فوراً راضی ہوگیا۔

لیکن ریتا ایک بات کی فکر ہے تم اتنی جوان لگتی ہو لوگ یہ نہ سمجھ لیں تم اور میں......

تو کیا ہوا یاسر لوگ جو مرضی سمجھتے رہیں کوئی پوچھے گا تو بتا دیں گے کہ تم اور میں ماں بیٹا ہیں۔ اس میں بھی تو میرے حسن کی ایک چھپی ہوئی تعریف ہے۔ کیا خوبصورت دعوت تھی۔ خوابوں کا سا سماں تھا۔ جگمگاتی رنگ برنگی روشنیاں، سات کورس کا ڈنر کے سات چالیس سال کی پرانی وائین لوہر مال کے باہر سوئمنگ پول میں ٹھہرے ہوئے پانی کو دعوت دے رہی تھی۔ تم کھڑے کیوں ہو لہریں کیوں نہیں بکھیرتے۔ اپنے اندر ارتعاش کیوں نہیں لاتے۔ بیٹھنے کے بعد کونیک نے سب کام کر دیا۔ اور یاسر کے اندر کے سوئمنگ پول میں لہروں کا طوفان اٹھا۔ بال روم میں یاسر جیسے لہروں کے تھپیڑوں کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ پورا جسم جشن منا رہا تھا۔ مختلف لڑکیوں کے ساتھ ڈانس کرتے کرتے وہ ریتا کے ساتھ ڈانس

کرنے لگا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی پرستان میں ہے۔ کونیک کے بہت سے ڈرنکس نے دونوں کو بالکل اپنے ہوش سے بے قابو کردیا۔ اور دونوں ریٹا اور یاسر گورنر ہاؤس کے ساتھ والے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے کمرے میں چلے گئے۔ یاسر کو ریٹا دنیا کی سب سے خوبصورت عورت لگ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے ریٹا کے کپڑے اتارنے شروع کیے اور خود بھی اپنے جسم کو کپڑوں سے آزاد کردیا۔ دونوں بستر میں گھس گئے۔ یاسر نے چومتے ہوئے ریٹا سے کہا۔ ہم نے کئی راز آپس میں پوشیدہ کئے ہیں۔ آج یہ حسین اور میٹھا راز بھی اپنے اندر پوشیدہ کرلیں۔ ریٹا تم دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت عورت ہو۔ ریٹا...... ریٹا......

فوراً مونا نے یاسر کے نیچے لیٹے ہوئے یاسر کو جھنجھوڑا۔ یاسر۔ میں مونا ہوں میں تمہاری ماں نہیں ہوں میں تمہاری بیوی ہوں۔ یاد ہے تم میرے ساتھ بستر میں گھسے تھے۔ اور فرائیڈ کو پڑھنا چھوڑ دو۔

☆☆☆

ہمت دواخانہ

چھر ر...... چھر ر...... چھر ر...... ماشکی کی مشک سے ریل بازار میں چھڑکاؤ کی مانوس آواز

تیری خیر ہووے پہرے دارا روضے دی جالی چم لیں اے۔ عالم لوہار کی آواز میں لطیف گراموفون ہاؤس پہ نعت کا بجنا معمول تھا۔

گھررڑ گھررڑ گھررڑ۔ خرشیداں جھنگن حسب معمول سائیکل کے ٹوٹے ہوئے مڈگارڈ سے نالی میں پھنسی ہوئی گندگی کو کریدتی اور مڈگارڈ اور جھاڑو سے تمام گندگی کو اکٹھا کر کے گلی میں پھینک دیتی۔

خالد بھانڈے والے۔ حاجی سنیارے۔ سیٹھ گلزار کپڑے والے۔ یسین گیس والے کی دکانوں کے کنڈوں کا زوردار آواز سے اوپر چڑھ جانے کی مسلسل آوازیں روز کا معمول تھا۔

میرا آج کالج میں فرسٹ ایئر کا پہلا دن تھا۔ نہا دھو کے پھر بال بنا کے سرسوں کے تیل سے جسم کو چمکایا اور براسو پالش سے سائیکل کو۔ لیکن کپڑے پرانے ہی پہن لیے

کیونکہ لڑکوں سے سن رکھا تھا۔ کہ بڑی جماعتوں کے لڑکے یا تو رنگ دار پانی یا فرسٹ ایڈ
فول کے نیچے کپڑوں پہ لگا دیتے ہیں۔

گھر سے گلی میں پہنچنے کے لیے چھوٹی سی تین سیڑھیاں تھیں۔نئی سائیکل تھی تو میں
سائیکل کو کندھے پہ اٹھا کر میں نیچے اتر ہی رہا تھا۔ کہ پیچھے سے کسی کی ہنسنے کی آواز آئی۔ میں
نے سائیکل سمیت ہی پیچھے گھوم کر دیکھا تو۔خرشیداں جھنگن کھڑی تھی۔

تمہارے تم سائیکل پر چڑھتے ہو یا سائیکل تم پر چڑھتی ہے۔کبھی میں اوپر کبھی یہ
میرے اوپر۔ میں ذرا جھینپ سا گیا لیکن اکڑ کے بولا۔

ہو تو تم سمجھدار ہونا بھی ایسا ہی چاہیے۔خرشیداں نے آنکھوں کو شرارت سے مٹکا
کر کہا

میں نے سائیکل کے پیڈل پہ پاؤں رکھا۔ کالج کی طرف روانہ ہو گیا۔ تمام
راستے میں خرشیداں کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے کبھی اسے نہایا دھویا نہیں دیکھا تھا۔
ہمیشہ گرد میں اٹے بال میلے کپڑے شاید ہفتوں مہینوں میں کبھی ایک بار نہاتی ہو گی۔ ہمارے
سمیت سارے محلے کے کوٹھے اتارتی تھی۔لیکن اب اس کا کام کم چلتا تھا۔ کیونکہ کافی
گھروں میں فلش سسٹم لگ گیا تھا۔تھی تو وہ میونسپل کمیٹی کی ملازمہ۔

لیکن محلے کے گھروں کے کوٹھے اتار کے اور کچھ گھروں کے اندر کی صفائی کر
کے اچھا خاصا گزارہ کر لیتی تھی۔

میں سارے راستے اس کے بارے میں سوچتا رہا سائیکل پہ سواری والے مکالمے
مجھے کچھ معنی خیز لگے۔سوچنے لگا کہیں یہ خرشیداں کا دعوت نامہ تو نہیں لو بھئی فوراً سر کو جھٹک
لیا۔ایک تو گندگی صاف کرنے والی اوپر سے مجھے وہ واقعہ یاد تھا۔ جب خرشیداں نے موچی
شاہ کو خوب سنائی تھیں۔موچی شاہ سے مجھے نفرت تھی۔ایک تو اس کی عجیب و غریب شکل
ابھرے ہوئے ماتھے پہ چھوٹی باریک آنکھیں تھوڑی ذرا سی تڑی تھی۔ ہر آنے جانے والی

لڑکی پہ فقرے کستا۔ خاص طور پہ میرے پیچھے پڑا تھا۔ مجھے اگر اس کی شکل دیکھ کے ہنسی آ جاتی۔ تو نعرہ مار کے میرے پیچھے بھاگتا۔ ہنسا تو پھنسا مسکرایا تو بغل میں آیا۔

خرشیداں کو ایک دن موجی شاہ نے حسبِ عادت فقرہ کس دیا تھا۔ کالی کھانسی کا علاج کالی جھنگن ہی کر سکتی ہے۔ جس کا جواب خرشیداں نے یوں دیا۔ آنکھوں کی بینائی دس گنا ہو جائے گی اگر کالے بھنگی کا ہاتھ لگ گیا۔ اور ساتھ ہی اپنا گندا جھاڑو موجی شاہ کے کولہوں پہ رسید کیا۔ ایسا لگا کہ واقعی موجی شاہ کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی بینائی ایک دم روشن ہو گئی ہو۔ اس کے بعد کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ خرشیداں سے چھیڑ چھاڑ کرے۔ ویسے بھی خرشیداں کا رویہ ہر ایک سے ناگوار ہی ہوتا۔ لیکن مجھے یوں دیکھتی جیسے موجی شاہ کہہ رہا ہو۔ ہنسا تو پھنسا مسکرایا تو بغل میں آیا۔ میں نے فوراً سر کو جھٹک دیا کہ میں کوئی لڑکی تھوڑا ہی ہوں۔ میں تو لڑکا ہوں لڑکا۔

تھکا ہوا گھر واپس آیا تو اماں جان کے سوال شروع ہو گئے۔ کالج میں پہلا دن تھا۔ کسی نے چھیڑا تو نہیں۔ تھک گیا، آ میں تیرے بال بنا دوں۔ تو فکر نہ کر پڑھائی میں مدد کی ضرورت ہوئی تو ٹیوشن رکھوا دوں گی۔ لیکن ماسٹر جی گھر آئیں گے پڑھانے کے لیے۔ مجھے اس بات پہ غصہ آ گیا۔ ماں! میں نے کالج جانا شروع کر دیا ہے۔ اور میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اب یہ روک ٹوک نہ کیا کر کہ اندھیرا ہو گیا ہے گھر سے باہر قدم مت رکھنا۔ میں کوئی لڑکی نہیں ہوں۔

ایک دن چھٹی کے دن موج مستی کو دل چاہا۔ کچھ ریزگاری اکٹھی کر کے حساب کتاب لگایا، تو سینما کی تھرڈ کلاس کے ٹکٹ کے پیسے پورے تھے۔ سوچا چلو فردوس سینما میں فلم دیکھی جائے۔ سینما گھر پر وحید مراد اور زیبا کی تصویروں کے ہاتھ سے بنے ہوئے بورڈوں کے نیچے سینما گھر کے گیٹ کے پاس ایک عجیب و غریب پتلا لمبا شخص تیل سے چپڑے ہوئے لمبے بال لیے جو کندھوں سے نیچے تک جاتے تھے۔ کان میں بڑا بالا ڈالے

مجمع باز سیاہ چہرے پر موٹی آنکھوں میں سیاہ سرمہ لگائے۔اس کے پیچھے بڑا سیاہ رنگ کا بورڈ جو سینما کے بورڈوں سے مختلف تھا۔ اور اس پہ سفید رنگ میں بڑے لفظوں میں لکھا تھا ''سانڈے کا تیل''۔اس کے چاروں طرف رنگ برنگی بوتلیں قطار میں مجمع باز کے دائرے کا تعین کرتی تھیں۔اس دائرے کے اندر کچھ چھپکلی نما حشرات الارض رینگ رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے ڈر سا لگا۔ اگر کوئی کیڑا دائرے سے باہر جانے لگتا تو مجمع باز پکڑ کے اندر چھوڑ دیتا۔ان جانداروں میں سے ایک کو پکڑا اور چھاتی سے چیر کر آگ کے چولہے پہ دھر دیتا آگ کی تپش جاندار کو پگھلا دیتی۔ پگھلا ہوا مادہ وہ ایک پیالے میں اکٹھا کرتا۔اور وہ بار بار کہتا یہ اصلی سانڈے کا تیل ہے جو مردانہ کمزوری کا مجرب نسخہ ہے۔اس کی مالش سے مردہ انسان میں بھی خواہشات زندہ ہو جاتی ہیں۔تعریفوں کے پل باندھے جا رہا تھا۔شو ٹائم کا خیال آتے ہی میں فوراً مجمع سے نکلا تو دیکھتا ہوں کہ سامنے خرشیداں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں بالکل اسے پہچان نہیں سکا۔سفید کپڑوں میں سانولی سلونی خرشیداں ابھرا ہوجسم تھا۔ ہنس کے بولی تجھے سانڈے کا تیل کاہے کو چاہیے۔ کس پہ آزمائے گا۔ آ تجھے میں سینما دکھاؤں۔ میں کھسانا سا ہو کر سٹک گیا۔

سینما میں خرشیداں مجھے زیبا کے روپ میں ناچتی ہوئی لگی۔ میں خود وحید مراد کے روپ میں یہ گانا وحید مراد کے ساتھ گانے لگا۔ میرے خیالوں پہ چھائی ہے۔ اک جھلمن متوالی سی کوکو کورینا۔کوکو کورینا۔

ہمارا گھر دو منزلہ تھا۔گلی سے سیڑھیاں سیدھی گھر کے دالان کو جاتیں جو خاصا کشادہ تھا۔ دالان کے وسط میں نلکا (ہینڈ پمپ) لگا ہوا تھا۔ برآمدے کے چاروں طرف تین کمرے تھے۔ ایک بیٹھک کے طور پہ استعمال ہوتا باقی کے اور دو کمروں میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے کوئی نہ کوئی سو رہتا۔ چوں کہ وہ نچلی منزل تھی دھوپ کی گرمی کم پہنچتی تھی۔لیکن ہم سب گھر والے دوسری منزل پہ رہتے تھے۔اوپر پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔لہذا نچلی منزل

کے نلکے سے پانی بھر کے اوپر کی منزل میں جمع ہوتا۔ آخر کار اس مشکل کو ابا حضور نے حل کر دیا۔ اوپر کی منزل پر سیڑھیوں کے ساتھ خالی کمرہ تھا جس کا ایک دروازہ سیڑھیوں میں کھلتا اور دوسرا اوپر کی منزل کے صحن میں۔ نلکے (ہینڈ پمپ) کا نل لمبا کر کے سیڑھیوں کے ساتھ والے کمرے میں پانی کا انتظام کر دیا اور اس کمرے کو غسل خانے میں بدل دیا گیا۔

پہلے خرشیداں کبھی کبھار پانی نیچے سے بھر کر اوپر لانے میں مدد کرتی لیکن اب اس کے کام میں بھی خاصی آسانی ہو گئی تھی۔ لیکن اسی ردو بدل سے اسے یہ بھی ڈر ہونے لگا اگر اس گھر میں بھی فلش سسٹم لگ گیا تو اس کی مکمل چھٹی ہو جائے گی۔

ایک دن مَیں غسل خانے میں نہانے کے بعد تولیے سے جسم خشک کر رہا تھا۔ کہ سیڑھیاں اترنے کی چاپ سنائی دی۔ فوراً میں نے سیڑھیوں کی طرف کھلنے والا دروازہ سے دیکھا تو خرشیداں نیچے اتری جا رہی تھی، مجھ میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس سے کچھ کہہ سکوں۔ لیکن اس خیال سے خاصا لطف اندوز ہوا۔ کہ سامنے کے دروازے سے اندر گھسو تا کہ سب سمجھیں میں نہا رہا ہوں۔ اور سیڑھیوں سے غسل خانے کے دروازے کا فائدہ اٹھاؤں۔ خرشیداں سے ملاپ کا خیال غسل گاہ سے خواب گاہ کا کام دے سکتی ہے۔ لیکن موجی شاہ کی بھرے مجمع میں بے عزتی کا منظر میرے سلگتے ارمانوں پہ نلکے کا ٹھنڈا پانی ڈال دیتی۔

سہ ماہی امتحان سر پہ تھے۔ اور خرشیداں کی پتلی مٹکتی کمر کے نیچے بھرے ہوئے کولہے میرے سر پر سوار تھے۔ بیالوجی کی کتاب اٹھاتا تو اس میں بنے جسم کے ہر عضو میں مجھے خرشیداں کے اعضا نظر آتے۔ نتیجتاً سہ ماہی امتحان میں فیل ہوا اور لیکچرر نے اشارہ دے دیا کہ اگر اگلے امتحان میں پاس نہ ہوئے تو پری میڈیکل سے نکال دوں گا۔ لیکچرر کا خبردار کرنا خاصا خوفناک تھا۔ لہٰذا پوری کوششیں جاری کر دیں۔ کوئی لیکچر چھوٹ نہ پائے۔ باقاعدگی سے غور سے ساری جماعتوں میں حاضری دیتا۔ لیکن جب تنہائی میں کتابیں اٹھاتا تو کم بخت خرشیداں کا لچکتا جسم اور دعوت رساں نگاہیں پیچھا نہ چھوڑتیں۔

ایک دن نہانے کے بعد غسل خانے میں کافی دیر تولیے سے جسم خشک کرنے کے بہانے خرشیداں کا انتظار کرنے لگا۔ جب خرشیداں آئی تو ہمت نہ پڑی کہ دروازہ کھول سکوں۔ اپنی ساری ہمت کو اکٹھا کیا بہت کوشش کر کے کانپتے ہاتھوں سے سیڑھیوں والا دروازہ کھولنے لگا تو اس کشمکش میں کنڈا تو نہ کھل سکا لیکن کمر پہ اٹکا تولیہ گر گیا اور میں غسل خانے میں نہانے کے بعد ایک دفعہ پھر پسینے سے نہا گیا۔

کالج جا رہا تھا تو پھر کم بخت موجی شاہ نے راستہ روک لیا۔ لگا پھر وہی بے بہودہ فقرے کسے آؤ نہ میری تعلیم یافتہ پیپسی کولا۔ ایک دن تمہارا ڈھکن بھی کھول دوں گا۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کے بھاگا۔

دن گزرتے گئے اور فائنل امتحان سر پہ آ گئے۔ والدہ نے تو امتحان سر پہ اٹھا رکھا تھا۔ کوئی بیچارے کو تنگ نہ کرے ملائی والا دودھ۔ ہر دو گھنٹے کے بعد پہنچ جاتا۔ نیا لوہے کا ٹیبل لیمپ بالکل خرشیداں کی لچک دار کمر کی طرح لیمپ کا سر جہاں بھی گھماؤ گھوم جاتا اور پوری روشنی کتاب پہ ڈالتا۔

لیکن جب بھی کتاب کھولتا تو خرشیداں جھنگن زیبا کی طرح لچکتی مٹکتی نظر آتی میں وحید مراد بنا۔ یوں گا رہا ہوتا۔

میرے خیالوں پہ چھائی ہے اک جھنگن متوالی سی......

بس اسی بے بسی کے عالم میں ٹیبل لیمپ بند کیا۔ تسلی دی فیل تو ہونا ہی ہے، نیند کیوں حرام کروں لمبی تان کے سولیا صبح پھر وہی۔

چھرز چھرز ماشکی کی مشک سے ریل بازار میں چھڑکاؤ کی آواز۔

تیری خیر ہوئے پہرے دارا روضے دی جالی چم لین دے۔ عالم لوہار کی نعت کا بجتا۔

گلی میں گھرز گھرز کی آواز خرشیداں کی موجودگی کا احساس دلاتی تھی۔

دکانداروں کے گیٹ زوردار آواز سے اوپر چڑھ جانے کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔

اور میرا فائنل امتحان۔ ہڑبڑا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ فوراً غسل خانے میں نہانے گھسا تو سیڑھیوں والے دروازے کا کنڈا چڑھانا بھول گیا۔

ابھی نہانے کی تیاری میں تھا تو خرشیداں نے ادھ کھلے کواڑ کو پورا کھول دیا اور دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

اوئے چھارے میرے سے مسکری کرتا ہے۔ پھر ہم یوں گتھم گتھا ہوئے جیسے ایک معرکہ سر کرنا ہو۔ ایک امتحان تھا جس میں اسی فیصد نمبر حاصل کرنے تھے۔ خرشیداں کا جسم پسینے سے شرابور ایسے لگ رہا تھا۔ جیسے کسی نے اس پہ سانڈے کا تیل مل دیا ہو۔ تیل کی حمق مجھے ایک طاقت بخش رہی تھی۔ اس کے جسم سے کچے چاولوں کی باس میرے دماغ کے کواڑوں کو کھول رہی تھی۔ اس کے جسم کی نرمی ایسی جیسے دریائے چناب اور جہلم سے اٹھی ہوئی چکنی مٹی ہو۔ ایک مدہوشی غالب ہوئی۔ اس مدہوشی میں محسوس بھی نہ ہوا۔ خرشیداں کس طرح مجھے جھنجوڑ رہی تھی۔ میری گردن پہ ناخن کا نشان اور دائیں پنڈلی پر دانتوں سے کاٹنے کا زخم میٹھی سی کسک چھوڑ رہی تھی۔ بس کیا تھا ایک وحشیانہ تجربہ تھا۔

جلدی سے تیار ہو کے گلی میں سائیکل پہ سوار ہونے لگا تو سامنے موجی شاہ اپنی مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔ ایک تو مجھے امتحان میں وقت پہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ اور نامکمل امتحان کی تیاری لیکن مجھ میں ایک انجانا سا اعتماد بھی تھا۔ جب حسب معمول موجی شاہ نے میرا راستہ روکنا چاہا۔ میں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ترکی مینڈھے کی طرح اچھل کے ایسی ٹکر اس کی ناک پہ رسید کی کہ وہیں لہولہان ناک کو پکڑ کے بیٹھ گیا۔ اور میں امتحان کے کمرے میں۔

پرچہ سامنے آیا تو تمام جوابات یوں کھل کھل کے سامنے آئے جیسے اُن میں

خرشیداں ہو، سوال نہ ہوں۔ دماغ نے ایسا ساتھ دیا کہ تمام لیکچر جو باقاعدگی سے سنے تھے، سامنے آ گئے۔

سالانہ امتحانات کے بعد جب پہلی دفعہ جماعت میں گیا۔ تو دل ڈر رہا تھا۔ پرچے واپس ملنے تھے اور مجھے یقین نہ تھا کہ میڈیکل کو جاری رکھ سکوں گا۔

لیکچرر نے سب کے رول نمبر اور نام پکارے پہلا نمبر الطاف حسین رول نمبر 286۔ 100 میں سے 36۔ میڈیکل میں جانے کے لیے 40% کا ہونا ضروری تھا۔ یوں الطاف بھی گیا اور اطہر بھی گیا۔ احترام بھی گیا۔ افسر بمشکل پاس ہوا۔

میرا دل دھڑک رہا تھا۔ افسر کے بعد میرا نمبر تھا۔ محمد نثار لیکچرر نے میرا نام پکارا اور پھر میرا رول نمبر 290۔ میں اپنی جگہ پہ کھڑا ہونے کے لیے شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ لیکچرر خاں خلیل اللہ خاں نے میرے پرچے کو بڑے غور سے دیکھا۔ کچھ اور وقت لگایا۔ پھر غور سے پرچے کو دیکھا اور پھر مجھے۔

پرچے کو اپنی عینک کے اندر سے دیکھا۔ اور مجھے عینک کے اوپر سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے۔ 100 میں سے 86 نمبر۔ پرچہ مجھے تھمانے کے بجائے مجھ سے سوال کیا۔ محمد نثار اتنے نمبر کیسے حاصل کیے۔

میری پنڈلی میں اچانک ٹیس اٹھی۔ میں نے ہاتھ لگا کے پتلون کے اندر پنڈلی کو چھوا تو دانتوں سے کاٹنے کا نشان ہاتھ سے محسوس ہوا۔ اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

جناب!

"سانڈے کا تیل"

"گول عینک کے پیچھے" ممتاز حسین کے قریباً بیس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان افسانوں کی پہلی خوبی یہ ہے کہ یہ سب کے سب مختصر ہیں۔ ایڈگر ایلان پو نے اپنی کتاب "دی فلاسفی آف کمپوزیشن" شائع شدہ ۱۸۴۶ء میں لکھا ہے کہ مختصر افسانہ اس کو کہا جائے گا جس کو ایک نشست میں پڑھا جا سکے۔ ممتاز حسین کے اس مجموعے میں شامل کسی بھی افسانے کو آپ آرام آرام سے ایک نشست میں پڑھ سکتے ہیں۔ ممتاز حسین اور ایڈگر ایلان پو کے افسانوں میں کسی قدر مشترک کی تلاش نہ کیجئے۔ پو ایک بڑا افسانہ نگار ضرور ہے لیکن اس کے افسانوں کی فضا ماورائی ہے۔ ایڈگر ایلان پو کے ہم عصر روسی افسانہ نگار گوگول سے بھی ممتاز حسین کے افسانوں کا کوئی میل نہیں اگرچہ وہ حقیقت پسند تھا۔ ممتاز حسین کے افسانوں کو پڑھ کر (میں نے سب افسانے پڑھے ہیں) میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ بندہ افسانہ نگاری کے سب گروں میں طاق نکلا۔ کہیں منٹو یاد آئے گا اور کہیں موپساں لیکن صرف یاد آنے کی حد تک، ممتاز حسین نے اردو فکشن میں بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی جگہ بنائی ہے۔ (عبداللہ جاوید)

"گول عینک کے پیچھے" میں ممتاز حسین کا قلم جدید انداز لیے معاشرتی اتار چڑھاؤ کا وہ آئینہ ہے جس میں شب و روز معاشرہ میں اُبھرتی برائیاں، بد اخلاقی شورشیں، زمانہ میں بکھری غم کی کہانیاں، اپنوں کی سرد مہری کی داستانیں اور انسانی جذبوں کی پگڈنڈی پر کروٹیں لیتی روایتوں کی سرگوشیاں اور سرمستیاں نہاں بھی ہیں اور پنہاں بھی۔ ان کہانیوں میں آزمائشیں ہیں، اُمیدیں اور پابندیاں ہیں جن کا اظہار کامیابی سے کیا گیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ افسانوں کا یہ مجموعہ نیویارک شہر سے شائع ہو کر شمالی امریکا کی ادبی شان دوبالا کر رہا ہے۔ (شائستہ سید ایمن، نیویارک)

ممتاز کوئی مصلح یا مبلغ ہے؟ جی نہیں، اُس کا اُسلوب فلاح یا اصلاح کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اُس کے اُسلوب کی بنیادی سعی تو یہ ہے کہ قاری خود کو سوالات، تجسس اور اقدار میں سموئے تاکہ وہ دوسروں کی زندگیوں میں اپنی زندگی کا رُخ تلاش کر کے تشفی اور سکون سے ہم کنار ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ انفرادی زندگی "جسم، معاشیات" کی زنجیروں سے آزاد ہو تاکہ دوری قرب میں ڈھلے، انکار اقرار کا درجہ پائے اور آزاری کی کوکھ سے قرار جنم لے۔ شمالی امریکا میں افسانوی ادب کے حوالے سے ممتاز حسین کا یہ مجموعہ، بلاشبہ، ایک موثر اور کامیاب اضافہ ہے۔ (پروفیسر مامون ایمن، نیویارک)

ہر وہ تحریر جو دنیا میں، ناانصافی، معاشرتی عدم انصاف اور فتنہ فساد پر احتجاج کرتی ہے اور پیار و محبت کو فروغ دیتی ہے، قابل قدر ہے۔ ممتاز حسین کی تحریروں میں محبت، احترام آدمیت اور قلم کی صداقت کا گہرا رچاؤ ملتا ہے اور سچ کی تلاش میں نکلے ہوئے لفظ ہمیشہ اپنی حرمت برقرار رکھتے ہیں۔

فراز عشق کی دنیا تو خوبصورت تھی
یہ کس نے فتنۂ ہجر و وصال رکھا ہے

ممتاز حسین کی صورت میں افسانہ نگاری کی بیل پر ایک نئی کونپل پھوٹی ہے۔ ہم مستقبل کے روشن امکانات کو دیکھتے ہوئے ممتاز کی کامیابی کے لئے دعا گو ہیں۔ (پروفیسر خالدہ ظہور، نیویارک)

Rs. 400.00

www.sang-e-meel.com